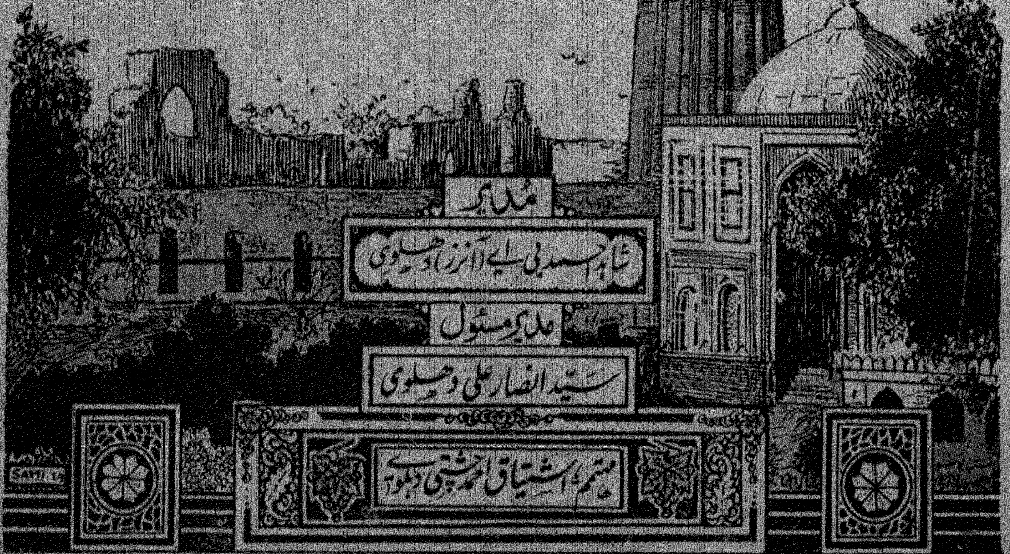
THE BOOK WAS DRENCHED

NASIR NUNMBER

اِس دَور میں مے اَور ہے جام اَور ہے جم اَور
ساقی نے بنا کی رَوشِ لُطف و کرم اَور
(اقبال)



اُردو کا علمی و ادبی ماہوار صحیفہ



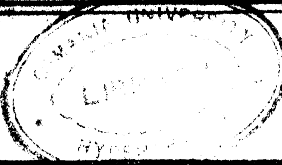
Annual Rs. 3/8/-

Price As.10.

بیادگار

خان بہادر میر ناصر علی مرحوم

تاریخ وفات ۱۲ر جون سنہ ۱۹۳۳ء



جُرعات

جلد ۸ — ساقی ـ "ناصر نمبر" ـ بابت ستمبر ۱۹۳۳ عیسوی — نمبر ۳

جرعات

جلد ۸ | ساقی - "ناصر نمبر" - بابت ستمبر ۱۹۳۳ء عیسوی | نمبر ۳

خان بہادر میر ناصرعلی مرحوم

Calcutta Art Press Delhi.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

میر صاحب کی وضعداری

"انسان کی زندگی کتنی ہی ناپائیدار کیوں نہ ہو، اسکے افعالِ نیک وبد کا اثر قیامت تک باقی رہتا ہے، بلکہ قیامت کے بعد تو ضرور ہی۔ مزاجِ یار کا اعتبار ہو نہ ہو چاہنے والوں کے لئے وفا کی شرط ہے۔ آسمان و زمین کا مدار گردش پر ہو تو ہونے دیجئے۔ پہاڑ اور درخت اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ دُنیا میں کچھ ہوا کرے، انسان اپنی وضع کا پابند رہے۔" میر ناصر علی

اُجڑے دیارِ شاہجہاں آباد کی اگلی بہاریں یوں بھی ہمارے لئے خواب کی سی باتیں تھیں مگر آہ! وہ مُقدس ہستیاں بھی جنہوں نے شاہی کی گہما گہمی اور پھر اُسے لُٹتے دیکھا ایک ایک کرکے ہم سے وداع ہوگئیں اور آج اُس درخشاں ماضی کو دیکھنے والی متبرک آنکھیں بھی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بند ہوگئیں۔ دلّی کی وضعداری ۵۷ء سے پہلے کی جو مشہور ہے وہ تو تھی ہی، لیکن اب بھی ایک آدھ پابندِ وضع صورت نظر آجاتی تھی۔ آن کی خاطر جان دینے کے بہت سے واقعات سُننے میں آئے مگر اِس آخری دور کی چند وضعدار صورتوں کو میں نے بھی دیکھا ہے اور اِنہی میں سے ایک مٹی ہوئی یادگارِ زمانہ پر مجھے عبرت کے آنسو بہانے اور عقیدت کے پُھول چڑھانے ہیں۔

خان بہادر میر ناصر علی صاحب دہلی کی اُن مخصوص ہستیوں میں سے تھے جنہوں نے مرتے دم تک وضعداری کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ وضعداری اُنکے مزاج میں اس درجہ رچ گئی تھی کہ نہ صرف پبلک لائف میں بلکہ پرائیویٹ لائف میں بھی اسکی بہت سی خوشنما جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اِس خوبی کا ثبوت اُنکے لٹریچر سے بھی ملتا ہے کہ جو روش ابتدا میں اُنہوں نے اختیار کی آخیر تک اُسے نبھاتے گئے۔ اِس سے زیادہ پابندیٔ وضع اور کیا ہوگی کہ اب سے کچھ اوپر نصف صدی پہلے "تیرھویں صدی" میں جس طرزِ خاص پر آپ نے قلم اُٹھایا تھا اُسے آپ "صلائے عام" کے آخری پرچہ میں بھی دیکھ لیجئے، اور پھر لٹریچر بھی ایسا رُودار کہ اُردو علم و ادب میں پہلی اور آخری چیز۔ اِسٹائیل ایسا وضعدار کہ اُنکے جیتے جی کسی اور سے نبھایا نہ گیا اور اُنکے ساتھ ہی ختم ہوا۔ لٹریچر میں میر صاحب کا یہ استقلال و استقامت دیکھتے ہوئے اوروں کو اقرار ہو یا نہ ہو مجھے اُنکی وضعداری پر مُبالغے تک اصرار ہے۔

یہ تو وہ میر صاحب تھے جنہیں دُنیا نے دیکھا۔ اب میں اُن میر صاحب کو دکھانا چاہتا ہوں جنہیں میں نے اور بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے، ذرا دیکھئے اُنکی خانگی زندگی بھی وضعداری کی کیسی عمدہ و مکمل مثال ہے۔

جوانی کی تو میں کہتا نہیں، ہاں بُڑھاپے میں مَیں نے میر صاحب کو سدا ایک ہی سا دیکھا۔ وہی خشخشی ڈاڑھی اور سادہ وضع۔ وضع بدلنے سے اُنہیں نفرت تھی۔ مُنہ میں صرف ایک دانت باقی تھا لیکن اسکے گر جانے پر بھی نقلی دانت نہیں لگوائے۔ یوں عینک نہیں لگاتے تھے مگر پڑھتے لکھنے کے وقت مجبوراً لگا لیتے تھے۔ آخری وقت میں آنکھوں میں پانی اُتر آیا تھا مگر ایک آنکھ بنجانے پر بھی عینک بادلِ ناخواستہ لگاتے تھے۔ تیل پُھلیل اور اسبابِ زینت سے خود بھی متنفر تھے اور مَردوں کیلئے اِنہیں عیب سمجھتے تھے اِسی لئے بنے سنورے نوجوانوں سے اُنکی کبھی نہ بنتی تھی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا اب اِس بات کو بیس سال ہوئے، میر صاحب کی وضع قطع میں کوئی فرق نہیں دیکھا۔ اپنے بُزرگوں سے میں نے سُنا ہے کہ جوانی میں بھی میر صاحب کو خوش پوشی کا شوق نہیں تھا اور بُڑھاپے میں یوں بھی بالعموم اچھے لباس کو جی نہیں چاہتا۔ میر صاحب انادی ([illegible]) تھے۔ چنانچہ اُنکا لباس سیدھا سادا اور تکلف سے بَری ہوتا تھا اور چونکہ جمالیاتی ذوق بھی پایا تھا اِسلئے مزاج میں نفاست پسندی بھی زیادہ تھی۔ لباس گرمیوں میں اگرچہ دُوریئے گاڑھے اور لٹھے کا اور جاڑوں میں دیسی فلالین کا ہوتا تھا مگر اُجلا اور صاف سُتھرا۔ ململ، تنزیب اور چکن وغیرہ کے کپڑے پہنے اُنہیں کبھی نہیں دیکھا۔ لمبا سا ڈھیلا ڈھالا کُرتا جس میں اچکن کی طرح چار جیبیں ہوتی تھیں، اور ان چار جیبوں کو وہ مزاحاً کہا کرتے تھے "یہ میرے چار نوکر ہیں"۔ لٹھے یا گاڑھے کا سیدھی موری کا پیجامہ، جاڑوں میں چھینٹ کا سینہ بند پہنتے تھے۔ اُونی سوئیٹر، ویسکوٹ یا گرم کوٹ، سخت سے سخت جاڑے میں بھی نہیں پہنتے تھے۔

مُلازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد مُستقلاً دہلی میں رہتے تھے اور روزانہ شام کو جامع مسجد پیدل جاتے تھے۔ جاڑا، گرمی، آندھی،

بھی غنیمت سمجھے جائیں گے۔

اندیشہ تھا کہ شاید نظم کا حصہ کمزور رہیگا لیکن یہ بھی توقعات سے زیادہ شاندار ثابت ہوا۔ حضرت ساحر دہلوی اور مولنا سیماب اکبرآبادی کی نظمیں بے مثل ہیں۔ جناب اکبر حیدری صاحب کی نظم بھی لاجواب ہے۔ نظم کا عنوان "ولیِ اُردو" شاہ دلگیر صاحب کا تجویز کردہ ہے امید ہے کہ اکبر صاحب پسند فرمائیں گے۔ حضرت احسن مارہروی اور جناب حیدر دہلوی کے قطعات اپنے اپنے رنگ میں قابلِ تعریف ہیں۔ جناب شاہد صدیقی کی نظم عمدہ ہے، یہ نظم شاہ دلگیر صاحب کی وساطت سے موصول ہوئی۔ اُنہی کے ذریعہ اظہارِ تشکر کرتا ہوں۔

غرض مضامین کے اعتبار سے ناصر نمبر اتنا اہم ہے کہ تاریخِ ادب میں یادگار رہیگا۔ ملک کے اس رفیع المرتبت انشاپرداز کی ایسی یادگار جس سے آیندہ نسلیں صحیح اندازۂ کمال کرسکیں اس سے بہتر نہیں ہوسکتی تھی اور اس کا سہرا سرتاسر محبی بھائی شاہد احمد صاحب کے سر ہے کہ یہ سب کچھ انہی کی وسعتِ پذیرائی اور انتہادرجہ کی علم دوستی کا نتیجہ ہے۔ فی الحقیقت اُردو صحافت کی تاریخ میں ایسا یادگار نمبر ابھی تک نہیں نکلا اور نہ آئندہ اُمید ہے۔ ساقی کو اس بات کا جائز فخر ہے کہ اُس نے صحافتی دُنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ایسی مثال قائم کردی جو اوروں کے لئے لائقِ تقلید رہیگی۔

آخر میں مجھے اُن تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی گرانمایہ جنبشِ قلم کی بدولت یہ رفیع الشان یادگار ظہور میں آئی۔ خدا کا شکر ہے کہ جس اہم کام کو میں نے اپنے ذمہ لیا تھا ان حضرات کی معاونت سے بحُسن وخوبی انجام پایا۔

انصار ناصری

قطعاتِ تاریخ انتقال خان بہادر میر ناصر علی صاحب مرحوم

از جناب چند بہاری لعل صاحب صبا جانشین حضرت مائل دہلوی مرحوم

حضرت مائل دہلوی میر صاحب مرحوم سے عقیدتِ خاص رکھتے تھے۔ میر صاحب مرحوم بھی اُن کے کلام کے مداح تھے اور "صلائے عام" کے ہر پرچے میں اُن کی غزلیں اور نظمیں اہتمام سے شائع کرتے تھے۔ افسوس یہ شاعرِ بے بدل میر صاحب مرحوم سے دو سال پیشتر اللہ کو پیارے ہوئے۔ اُن کے لائق جانشین حضرت صبا نے میر صاحب مرحوم کے انتقال پر یہ قطعات عنایت کئے جو شکریہ کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔ یہ قطعات تاخیر سے وصول ہوئے ورنہ ترتیب میں شامل ہوجاتے۔

از دارِ دُنیا چوں رخت بستہ | مطلوبِ رحماں ناصر علی خاں
گفتا صبا ہم سالِ رحیلش | مقبولِ یزداں ناصر علی خاں
۱۹ ۶ ۳۳

دیگر

در سنِ ہشتاد و یک چوں از قضا | خانِ والا مرتبت ذی جاہ مُرد
سالِ رحلت اے صبا از غیب گفت | ہاتفے۔ ناصر علی خاں آہ مُرد
۱۳ ۵ ۵۲

"بیادِ ناصر"

(از جناب انتصار علی خلف الرشید ناصر علی صاحب مرحوم)

فرض کردم کہ بہ یاد تو دلم خرسند است
لیکن این دیدۂ دیدار طلب راچہ علاج

کچھ فطرت انسانی میں داخل ہے کہ جب اپنا کوئی شفیق، مربی اور محبوب ترین عزیز جدا ہوجاتا ہے داغ مفارقت دیدیتا ہے تو مہجورین اپنے دلِ حزیں کو تسکین دینے کے لئے اس مرحوم ہستی کے کارناموں کا کثرت سے ذکر کیا کرتے ہیں اور اس طرح کے ذکر خیر سے دل کی بھڑاس نکالا کرتے ہیں۔ ادارۂ ساقی کو میرے والد مرحوم سے ایک خاص مناسبت ہے اور اس موقعہ پر "ناصر نمبر" کا اجرا اس "صف ماتم" کا مرادف ہے جو مرنے والے کے ذکرِ خیر کیلئے بچھائی جاتی ہے۔ موقعہ و محل تھا کہ میں بھی اس "صف" میں شریک ہوتا، دوست اور شناسا کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے جو عرف عام میں الولد سر لابیہ کہلاتی ہے۔ جب سے بھائی شاہد کے اس مستحسن عمل کی صدا کانوں میں پڑی ہے آج تک صدہا دفعہ کوشش کی ہے کہ بھی چند سطور حوالۂ قلم کروں کیونکہ سر لابیہ ہونے کی حیثیت سے مجھ سے زیادہ دوسرا کوئی اس میدان میں قلم نہیں دوڑا سکتا ہے۔ مگر آہ! میں اپنی ہر کوشش کو سعی لاحاصل پاتا ہوں۔ میرا ہر سعود نزول کی صورت اختیار کرتا جاتا، اپنے منتشر دماغ کو یکجا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر بے سود۔ محزون اور ملول دل کو ڈھارس دیتا ہوں مگر بے کار۔ اپنے از کار رفتہ اعصاب میں جان پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر بے حاصل۔ آہ ایک طرف تو میرا یہ ادعا کہ مجھ سے بہتر کوئی اس موقعہ پر واقعہ نگاری نہیں کرسکتا۔ اس بزرگ اور محترم ہستی کے کارنامے پیش نہیں کرسکتا، دوسری طرف میری یہ مجبوری کہ میں لب کشائی کرنے سے قاصر، قلم چلانے سے عاری۔ ایک تو صدمۂ عظیم نے کمر توڑ دی، ہوش و حواس میں اختلال پیدا کردیا اور میری حالت یہ ہے کہ ؎

دیکھ اے گل چیں اسے کہتے ہیں فرطِ اتحاد — تونے توڑے پھول میں بے بال و پر ہونے لگا

دوسرے یہ کہ اس مجموعہ کمالات اور سراپا خوبی کا کس پہلو سے تذکرہ کیا جائے۔ مرحوم کی متمدن زندگی کچھ عزیزو اقارب اور دہلی تک محدود نہیں تھی بلکہ ایامِ ملازمت میں جہاں جہاں رہے علم و فضل، اخلاق و تہذیب کا ایک باغ لگا آئے جو آج تک سرسبز چلا جاتا ہے۔ یہ ہی حال علمی مشاغل اور ادبی شغف کا تھا۔ آخری دم تک قلم اور کتاب ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ ملازمت سے سبکدوش ہوتے ہی "مضمونِ پریشاں" کا دفتر کھل گیا۔ "صلائے عام" ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گیا۔ یہ نادر رسالہ جن مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر اور جس معیار ادبی پر جاری کیا گیا تھا افسوس ہے کہ ان کے بعد آج تقابلاً بھی اسکو جاری نہیں رکھا جاسکتا۔ آخری وقت تک

مضمون نگاری اور میرے نام خطوط، دو ایسے شغف باقی رہ گئے جو ان کی بے مثل جولانیٔ قلم کے لئے میدان فراہم کرتے رہے۔

انسان سفر میں آتے جاتے دم لینے اور سستانے کے لئے کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ جاتا ہے تو مدۃ العمر تک جب کبھی اُس راستہ سے گذرتا ہے اس درخت اور اس کے سایہ کی آسائش کو یاد کرتا ہے میں نے اپنے پچاس سالہ سفر زندگی میں اس درخت کے سایہ عاطفت میں آرام پایا ہے اس "یاد" کے متعلق کن الفاظ میں تذکرہ کروں۔ بس اب تو نظام جسم کے تمام جذبات۔ سارے احساس۔ کل قویٰ کھنچ کر ایک مرکز پر آگئے ہیں، اور ان ساری قوتوں نے صرف ایک شکل اختیار کرلی ہے اور وہ جوشِ گریہ۔ خروشِ نالہ و فریاد اور آہ و بکا ہے۔ چاہے زندگی کے تمام کاموں میں اب میں قاصر ہوں مگر ہاں اسباب پر قادر ہوں کہ قبلہ و کعبہ کی یاد میں بقیۃ العمر روتا رہوں، شاید یہ بھی ایک ریاضت ہو طاعت ہو اور اس کے صلہ میں پھر اسی بزرگ و گرانقدر ہستی کے سامنے شرفِ باریابی حاصل ہو مگر آہ یہ کب ممکن ہے ؎

عرفی اگر بگریہ میسّر شدے وصال صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

قبلہ و کعبہ کی ادبی زندگی کچھ میرے لئے نہیں بلکہ دلّی والوں کے لئے مایۂ ناز ہے۔ مرحوم نے اپنی ادبی خدمات کو کبھی نام و نمود کا سرچشمہ نہ بنایا ورنہ اس زود رواں اور جولاں قلم ہستی کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ آج تصانیف کا بیش بہا خزانہ موجود ہوتا۔ مرحوم کو اپنے فانی ہونے کا اس درجہ جوشِ عقیدت تھا کہ فنا ہو جانے کے بعد دُنیا میں اپنے نام و نمود کو ایک ڈھکوسلے سے زیادہ نہ سمجھا۔ قدرت نے مزاج میں استغناء کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ ارتحال سے پانچ روز قبل جو گرامی نامہ اس خستہ دل کے نام ارقام فرمایا تھا سروست وہ میسّر ہے کہ اس بزم عزا میں شریک کردیا جائے۔ یوں تو میرے پاس اس وقت ہزاروں خطوط موجود ہیں جو خانگی امور کے تذکرہ کو حذف کر دینے کے بعد ادبیات کے شہ پارے ہیں مگر میں اس خط کو سب سے اولیٰ تر اس لئے سمجھتا ہوں کہ یہ چند سطور حیات و موت کا لبسیط فلسفہ ہیں اور یہ خط ٹھیک اس وقت لکھا گیا ہے جب راہیٔ ملکِ عدم نے اپنی منزل کو اُفقِ زندگی پر دیکھ لیا تھا۔ یہ خط میرے لئے کس درجہ مسکّن اور دلِ محزوں کو قرار دینے والا ہے اسکو "نظر ہوشیار" اچھی طرح سمجھ لیگی اور جان لیگی کہ یہ چند سطور مواعظ حسنہ کی آخری کڑی ہے:۔ ؎

"سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالب خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے"

بیٹا۔ شاید لکھنے کا یہ آخری موقعہ ہو۔ اس چار مہینے میں جو کچھ گذرنی تھی گذری۔ اس کے بعد اللہ ہی اللہ ہے گمان یہ ہے کہ میں جانبر نہ ہوسکوں گا۔ ہاتھ پیروں کی طاقت سلب ہوگئی خدمت گو اچھی ہوئی مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا ؎

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جانگداز تو غم خوار کیا کرے

تم سے جہاں تک ہوسکے جلدی آنا۔ بصارت تو خدا نے دوبارہ مجھے دی۔ لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں، فائدہ

صرف اتنا ہے۔ کہ تم آؤ تو تمہیں دیکھ لوں۔ گھر کا کام اور خود گھر ابتر پڑا ہوا ہے۔ اس کا حق بھی جتنا مجھ پر ہے اتنا ہی اولاد پر ہے۔ انصار کو تم نے بھیجا میں خوش ہوا۔ خدا تم کو خوش رکھے۔ اور کیا لکھوں ؎

کہیں حقیقت جانکاہی مرض لکھیئے
کہیں مصیبت ناسازی دوا کہیئے"

شاہد صاحب "ناصر نمبر" کی ترتیب اور تنظیم پر ہر طرح شکریہ کے مستحق ہیں۔ ارادہ ہے کہ ذرا ہوش درست ہو جائیں تو میں مرحوم کے چیدہ خطوط ارباب ذوق کے لئے پیش کروں۔

خستہ دل انصار

"ساقی افسانہ نمبر"

سائز ۲۰×۳۰/۸ حجم ۲۳۲ صفحات سرورق دیدہ زیب قیمت فی پرچہ ۱۲ر رسالہ "ساقی" دہلی کو اردو رسالوں میں جو حیثیت حاصل ہے اور جناب شاہد احمد صاحب جس قابلیت اور صلاحیت کے نوجوان ہیں اس سے ہندوستان کا ہر وہ شخص جو اُردو ادب سے ذوق رکھتا ہے واقف ہے۔ حال میں ساقی نے ایک افسانہ نمبر شائع کیا ہے جو اسوقت ہمارے زیر نظر ہے۔ اس نمبر میں بلند پایہ فلسفیانہ اور نفسیاتی افسانے، اور اعلیٰ درجہ کی دلکش نظمیں موجود ہیں۔ جو اپنے گوناگوں مضامین اور شگفتگی بیان کی وجہ سے اُردو ادب کا ایک اہم باب بن سکتے ہیں۔ حقیقت میں ایسے اعلیٰ درجہ کے مضامین شائع کرنا اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ کرنا ہی ساقی کا جو ادبی معیار ہے وہ ہمیں انگریزی کے اعلیٰ درجہ کے رسالوں کی یاد دلاتا ہے اس کے علاوہ ترتیب مضامین لکھائی چھپائی اور کاغذ بہترین ہے۔

افسانوں میں "نعمانی" (از قیسی رامپوری) "تفسیر حیات" (از ایڈیٹر ساقی) "افسانۂ خونچکاں" (از جناب ایم۔ اسلم "اتباع ابلیس" (از جناب فضل حق قریشی) "بت اور بانو" (از جناب ضمیر ہاشمی) اور نظموں میں "بصارت و بصیرت" (از علی اختر۔ اختر) "باغ کی سیر" (از ماہر القادری) "کملا" (بیگم مارہروی) "یاد ماضی" (ثاقب کانپوری) "کیفیات" (از کوکب شاہجہانپوری) وغیرہ ایسے مضامین جن کی جسقدر داد دیجائے کم ہے۔ دو تین تصاویر بھی معیاری ہیں اور آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں۔

ماشاءاللہ ساقی جب سے جاری ہوا ہے ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے، اور جو اعلیٰ معیار اس نے اپنا برقرار رکھا ہے وہ ملک دوسرے رسائل کے لئے قابل تقلید ہے۔

ہم ناظرین سے "افسانہ نمبر" کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔ "افسانہ نمبر" کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی افسانہ نویسی کسقدر ترقی کر رہی ہے۔

"ندیم"۔ گیا۔

خان بہادر ناصر علی صاحب

(از حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہٗ)

رسالہ ساقی کا تمام دہلی والوں کو ممنون ہونا چاہیئے کہ وہ دہلی کی ادبیت اور ادیبوں کی شخصیت نمایاں کرنے اور قائم رکھنے کیلئے ہمیشہ سرگرم عمل رہتا ہے۔

خان بہادر مولوی ناصر علی صاحب کی یادگار میں "ناصر نمبر" شائع کرنا ایک ایسا کام ہے جس میں سب دہلی والوں کو حصہ لینا چاہیئے کیونکہ خان بہادر مرحوم دہلی کے موجودہ دور انشا پردازی میں قدیمی بزرگوں کی یکتا اور بےنظیر وبےمثل یادگار تھے، اُن کی صورت میں قدامت تھی۔ اُن کے لباس میں قدامت تھی۔ اُن کے بولنے میں قدامت تھی یہاں تک کہ جب وہ کسی کی بات سُنتے تھے یا کسی کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتے تھے تو اس میں بھی ایک عجیب مؤثر ادائے قدامت کی ہوتی تھی۔ اُن کی انشاپردازی ساخت، اور آورد اور آمد کا مجموعہ تھی مگر سلاست۔ لطافت اور بزرگانہ شان ہر فقرہ اور بندش میں پائی جاتی تھی۔ دہلی میں مجھ جیسے چند لکھنے والے خواہ کسی قسم کے تعلّی آمیز دعوے اپنے مخصوص طرزِ تحریر کی نسبت کریں لیکن جو بات مولانا ناصر علی کی تحریر میں تھی وہ ہم میں سے کسی کو بھی میسّر نہیں ہے ان کے رسالہ کا نام "صلائے عام" تھا جو ایک مشہور مصرعہ، "صلائے عام" ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے" کا ایک حصہ ہے۔ مگر جب نہ یار رہے نہ نکتہ داں رہے تو "صلائے عام" کے ایڈیٹر دُنیا میں کیوں رہتے۔

اس سال دہلی کے دو مشہور انشا پرداز دُنیا سے چلے گئے اور اتفاق سے دونوں کا نام ناصر تھا، ایک ناصر نذیر فراق اور دوسرے مولانا ناصر علی۔

میرے بچپن کا ذکر ہے۔ مولانا ناصر علی کسی مشہور علمی یوروپین کے ساتھ درگاہ میں آئے تو فل بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں انگریز جوتیوں سمیت درگاہ کے اندر آجاتے تھے۔ مولانا دروازہ پر کھڑے رہے اور اُس انگریز کو میں نے درگاہ دکھائی۔ میں نے کہا آپ بھی جوتا اُتار دیجئے اور اندر آجایئے۔ مُنہ پھیر کر جواب دیا۔ اگر جوتا اُتارنا بےعزتی ہو تو میں اس گورے کے سامنے بےعزت ہو کر اندر جانا نہیں چاہتا۔ درگاہ سے واپسی کے بعد میں نے کہا آپ عمامہ باندھے ہوئے ہیں اور مولویوں کا چوغہ بھی ہے پھر یہ فل بوٹ کیوں پہنے ہیں۔ میرا یہ سوال مولانا کو ناگوار ہوا اور بگڑ کر فرمانے لگے۔ پاؤں میں پہنا ہے سر پر نہیں اوڑھا اور تم ایسے سوالات کیوں کرتے ہو۔ اِس وقت تک مولانا سے واقف نہ تھا پھر جامع مسجد کے نیچے پُرانی کتابوں کی دوکانوں پر مولانا سے کئی بار ملاقاتیں ہوئیں اور وہ نہایت مہربانی سے پیش آنے لگے۔ ان کی معلومات کا یہ حال تھا کہ جس فن کی کتاب ہاتھ میں لیتے تھے اُس فن کی بیشمار کتابوں اور مصنّفوں کے حالات بیان کر ڈالتے تھے

حضرت اکبر الہ آبادی ان کے بہت مداح تھے اور صورت میں بھی وہ حضرت اکبر سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے۔

حسن نظامی

جہان آباد کا گوہرِ درخشندہ

(از علامہ راشد الخیری۔ دہلوی)

چمنستانِ جہاں آباد کی بہار جو ۱۸۵۷ء میں اُجڑ چکی تھی۔ علم و فضل جن کے قدم چومتا تھا کمال جن کے روبرو دست بستہ تھا مدتیں ہوئیں رخصت ہو چکے تھے۔ مگر اُن کی متبرک صورتوں کو دیکھنے والی آنکھیں اب تک کھُلی ہوئی تھیں جنکے ٹھنڈے سانس مٹنے والوں کی یاد میں کبھی کبھی دو آنسو گرا لیتے تھے۔ اب وہ بھی بند ہو رہی ہیں اور جن سدابہار پھولوں کی شمیم انگیزیاں رستہ چلنتوں کے دل مسخر کر لیتی تھیں صحبتِ شب نے جنکو پارس اور جمالِ ہمنشیں نے جن کو کُندن بنا دیا تھا اُن کے بھی چل چلاؤ کا وقت آ گیا۔ اور آج ہم کو چمنِ ادب کی بزمِ فانی کے اُس گوہرِ درخشندہ کو وداع کرنا ہے جو ناصر علی کی ہیئت میں ہمارے سامنے جادہ گر تھا جس کے قلم نے موتی لٹائے اور زبان نے پھول برسائے جو کل تک ہمارے ساتھ تھا اور آج ابدی نیند سو رہا ہے۔

سید ناصر نذیر کے فراق نے خون کے آنسو رُلا دیئے۔ دلّی کی وضعداری اُن کے ساتھ ختم ہوئی۔ ابھی آنکھیں اُن کی صورت کو اور دل اُن کی یاد میں تڑپ رہا تھا کہ خان بہادر سید ناصر علی صاحب بھی ہمیشہ کو بچھڑ گئے۔ اُنھوں نے اُردو ادب کی حقیقی خدمت کی ہے اور جو روش شروع کی تھی آخر تک اُس پر قائم رہے۔ اُن کی تحریریں باوجود انحطاطِ قُوا اور اضمحلال کے ہمیشہ شگفتگی رہی اور زندگی کے اِس آخری وقت میں بھی ان کا توسنِ ظرافت کسی جگہ نہ ٹھٹکا۔ عمر کی ترقی کے ساتھ۔ اُن کا جسدِ خاکی رُو بہ فنا ہوا۔ مگر اُن کا دل و دماغ حدودِ شباب میں سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ اور یہ ایک ایسا امتیاز تھا جو کم آدمیوں کو نصیب ہوتا ہے۔

خان بہادر سید ناصر علی کی زندگی ہم کو اساتذہ کی جیتی جاگتی تصویر دکھا دیتی تھی اُنمیں ذوق کی سنجیدگی غالب کی تنک مزاجی اور داغ کی شوخیوں کی ایسی جھلکیں موجود تھیں کہ میں نے کئی مرتبہ اُس کا لُطف اُٹھایا۔ میری پہلی ملاقات خان بہادر مرحوم سے شاید ۱۸۹۰ء میں ہوئی۔ ملاقات کیا نہ یارنت کہنا چاہیئے۔ میرے پھوپھی زاد بھائی مولوی انور حسین مرحوم کی شادی اُن کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی میں بھی بارات میں شامل تھا۔ بھائی انور مرحوم کی شادی کے ساتھ ایک اور لطیفہ یاد آ گیا۔ خاندان کے شادی بیاہوں کے رُقعے شمس العلما مولوی نذیر احمد مرحوم لکھا کرتے تھے، دسمبر کا مہینہ تھا اور مولانا مرحوم انجمن حمایت الاسلام کے لکچر کی تیاری کر رہے تھے۔ خاندان ہی میں ایک اور بزرگ بھی تھے۔ تھے تو جیّد عالم مگر خدا اُن کی روح کو نہ شرمائے یہ خبط سما گیا تھا کہ مجھ سے بہتر شاعر شہر بھر میں کیا ہندوستان بھر میں نہیں ہے۔ اُنھوں نے اس شادی کا رقعہ لکھا۔ افسوس ہے مجھے اُس کا صرف ایک شعر یاد ہے اسقدر اور ملحوظ رہے کہ خان بہادر سید ناصر علی کے والدِ مرحوم کا نام مولوی سید ابو المنصور تھا۔ اب بزرگِ خاندان کا شعر ملاحظہ ہو، یہ رقعہ کا ایک شعر ہے:۔ ؎

وہ منصور علی مرجع خاص و عام | کہ آتا نہیں بحر میں جنکا نام

یہ رقعہ مولوی نذیر احمد صاحب کی خدمت میں بھی پہونچا۔ جب اُسکی خوب ہنسی اُڑ چکی تو عمّ مرحوم نے خود رقعہ لکھا، افسوس اُسکے بھی مجھے دو تین ہی شعر یاد ہیں۔ غالباً میاں اسعد الاشرفی کو سب یاد ہوں گے۔ یہ یاد رہے کہ اُسوقت کے رقعوں کا عنوان اکثر یہ شعر ہوتا ہے

للّٰہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست | آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

مولوی نذیر احمد صاحب فرماتے ہیں ؎

ہمہ داں حامیٔ دیں مولوی ابوالمنصور | جنکے افضال سے آگاہ ہیں نزدیک و بعید

اُنکا دولتکدہ ہی بزم گہہ عقدِ نکاح | کہ وہ خود جائے مبارک ہے مگر قابلِ دید

نہ مزامیر نہ باجا نہ سرود اور نہ رقص | اور نہ بدعت کے مراسم سے کوئی امر جدید

عقد کے دوسرے دن ہوگا ولیمے کا طعام | جو میسر ہو زنان و نمک و آش و ثرید

آپ اگر لائیں گے تشریف براہ شفقت | میں یہ سمجھونگا کہ بے دام لیا مجکو خرید

یہ رقعہ اس مضمون سے زیادہ متعلق نہیں اس لئے پھر فراشخانہ میں چلنا چاہیئے جہاں بارات بیٹھی ہوئی ہے۔ دلّی میں اس وقت قاعدہ یہ تھا کہ جب دلہن رُخصت ہوتی تھی تو دولہا خُسر کی خدمت میں سلام کو جاتا تھا اور سلامی لے کر رخصت ہوتا تھا، خان بہادر صاحب نے اس رسم کو جائز نہ سمجھا یا یوں کہو کہ داماد کو آنے کی اجازت نہ دی۔ دولہا کے ماموں اور میرے چچا خان بہادر مولوی عبدالحامد صاحب نے کہلا کر بھیجا کہ اجازت ہو تو میں ملاقات کے لئے حاضر ہوں۔ اس کا جواب یہ آیا کہ "آپ میری طبیعت سے واقف نہیں، میں آپ کے مذاق سے آشنا نہیں۔ آپ دولہا کے ماموں ضرور ہیں مگر اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ آپ میرا اور اپنا دونوں کا وقت ضائع کریں۔" جب بارات چلی ہے تو ہم نے دیکھا کہ ایک صاحب کھدّر کا کُرتا پہنے سیٹر سیٹر کرتے چلے جارہے ہیں معلوم ہوا خان بہادر سید ناصر علی صاحب یہی ہیں۔ یہ پہلی ملاقات، یا زیارت کی کیفیت ہے۔

دوسری ملاقات اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے اور وہ اس طرح کہ عصمت کے ایک نامہ نگار میری ملاقات کو بمبئی سے تشریف لائے۔ اُنہوں نے خان بہادر صاحب سے ملنے کا شوق ظاہر کیا۔ اور یہ بھی خواہش کی کہ میں اُنکے ساتھ چلوں۔ چنانچہ میں اُن کے ساتھ گیا۔ گرمی کے دن تھے اور چار بجے کا وقت۔ اطلاع کی، طلبی ہوئی، اوپر گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ خان بہادر صاحب کھدّر کی مرزئی پہنے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ بجلی کا پنکھا اُس وقت تک عام نہیں ہوا تھا مگر وہاں نہ فراشی پنکھا تھا نہ ہاتھ کا پنکھا۔ خان بہادر صاحب نے سلام کا جواب دیتے ہی فرمایا "ارشاد"؟ نامہ نگار صاحب نے پانچ روپیہ سامنے رکھے اور کہا "صلائے عام" "جاری فرما دیجیئے" خان بہادر صاحب نے اُن کی صورت دیکھی اور دو سوال کئے "وطن"؟ اور "مشغلہ"؟ اس کے بعد فرماتے ہیں "تم پرچہ لے کر کیا

کروگے۔"صلائے عام" تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتا"۔ اس کے بعد مجھ سے فرمایا تمہارا کیا نام ہے۔ میں نے نام بتایا۔ "ہاں تم سمجھ سکتے ہو"۔ خیر پرچہ تو جاری ہوگیا مگر اس گفتگو میں نامہ نگار صاحب کو بھی مزا آگیا۔ اور اب بھی جب کبھی خیال آتا ہوگا تو ضرور اس کا لُطف اُٹھالیتے ہوں گے۔

تیسری ملاقات بھی کچھ کم پُرلطف نہیں۔ عزیزوں میں سے ایک صاحب نے اپنے داماد کی تشریف آوری کے سلسلے میں خاندان کے بعض افراد کو کھانے پر جمع کیا۔ یہ داماد بھی باعتبار وجاہتِ ظاہری خان بہادر صاحب سے کئی لفظ آگے تھے۔ مجمع مختصر تھا مگر کثرِ مولویوں کا۔ دسترخوان پر کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کی ڈاڑھی شرعی نہ ہو۔ خان بہادر صاحب تشریف لائے اُن کے ساتھ ایک آٹھ نو برس کا لڑکا تھا۔ یہ مجھے خبر نہیں کہ پوتا تھا یا نواسا۔ اُنہوں نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور شاید میں ہی سب سے زیادہ گنہگار نظر آیا کہ ہر طرف سے ان صداؤں کے باوجود کہ "اِدھر تشریف لائیے" سب کو چھوڑ چھاڑ میرے پاس آ بیٹھے۔ اُن سے کھانے کے واسطے کہا گیا تو صاف انکار کردیا اور فرمایا "میں کہیں جاؤں نہ کھانا کھاؤں۔ صاحبِ خانہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا اُنہوں نے کہا کہ بیٹی کا معاملہ ہے میں چلا آیا۔ اس لڑکے کو اسی واسطے لے آیا ہوں کہ کھانے میں شریک ہوجائے۔ بچّہ کھانے میں شریک ہوا خان بہادر صاحب جب تک بیٹھے اُن کا روئے سخن میری ہی طرف رہا۔ جب لڑکا کھانا کھا چکا اور ہاتھ روک کر پانی مانگا تو خان بہادر صاحب نے فرمایا۔ "دیوانہ ہوا ہے۔ عالموں کا گھر۔ مولویوں کا دسترخوان۔ رکابی اس طرح سے چاٹ کہ ٹس تک نہ رہے"۔ اس کے بعد مجھ سے فرمایا۔ "کیوں حضرت مکّہ میں جھاڑو دینی آسان تھوڑی ہے"۔ اب جو داماد صاحب کی شامت آئی تو اسلیئے کہ خود بھی خطاب یافتہ تھے۔ دریافت کرنے لگے کہ فرصت کا وقت کونسا ہے کل میں بھی حاضر ہوں۔ "تشریف لاکر کیا کیجئے گا اور کس مسئلہ پر بحث کیجئے گا۔ یہ وقت کسی ایسے شخص کے پاس گذاریئے جو آپ کے مذاق کا ہو۔ خود بھی محظوظ ہو آپکو بھی خوش کرے"۔ اب تمام مجلس میں سنّاٹا تھا اور سب ایک دوسرے کا مُنہ تک رہے تھے۔

آخری ملاقات میری ایک بزمِ میلاد میں ہوئی۔ میں نے اپنی عمر میں بڑے بڑے غیر معقول واعظ دیکھے ہیں ایک مولوی صاحب کو یہاں تک بیان کرتے سُنا ہے اور کسی گھر میں نہیں بیچ بازار میں جامع مسجد کے نیچے کہ "جُبب پر تھی راج نے اکبر پر حملہ کیا"۔ مگر یہ مولود خواں اُن سے بھی بڑھا ہوا تھا جس نے شروع سے آخر تک کلام اللہ کی آیتوں کے سوا ایک بات بھی بیج نہ کہی۔ مگر میں اُس وقت بھی متعجب تھا اور آج بھی کہ خان بہادر صاحب ہی فرماتے رہے کہ "سچ کہتا ہے۔ سچ کہتا ہے"۔

آج کی دُنیا میں بہت کم افراد ایسے ہوں گے جو خان بہادر مرحوم کی اس طبیعت کا لُطف اُٹھائیں، مگر

خاک جہان آباد ایسی بہت سی ہڈیاں اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھے کہ ان کا صداقت ہر روز طواف کرتی ہے پابندیٔ وضع اور صفائیٔ قلب عمر بھر اُن کی چیلیاں رہیں اور تصنع اور نفاق اُن سے ہزاروں کوس دُور رہے۔ اُنکی کتابِ زندگی کا ہر صفحہ اور صفحہ کی ہر سطر پڑھنے والوں کو سچائی کے معنی بتا دیتی ہے یہ وہ لوگ تھے جن کی گردنیں زندگی اور زندگی کی کسی ضرورت کے سامنے خم نہ ہوئیں۔ شاہ و گدا اُن کے سامنے ایک تھے۔ مگن رہے اور مطمئن گئے۔

ضرورت ہے کہ خان بہادر مرحوم کے واقعات حقیقت کی کسوٹی پر پرکھیں جائیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت کے تعلقات جن کی بنیادیں مکر و ریا کے ان دو الفاظ پر قائم ہیں (Very glad ، Very sorry) اس سچائی اور صفائی کے مقابلے میں کیا وزن رکھتے ہیں۔ بہر حال سید ناصر علی رخصت ہوئے اور اب اُن کے واسطے ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی آرزو نہیں کہ جس طرح چمنستانِ ادب کا یہ باغبان "صلائے عام" میں زبان کے پھول برسا گیا معبودِ حقیقی اُس کی روح پر رحمت کے ایسے ہی پھول برسائے۔

"ہو گیا گُل چراغِ بزمِ ادب"

۱۳۵۲ھ

قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات خان بہادر میر ناصر علی مرحوم دہلوی

میر ناصر علی نے رحلت کی — وائے بیدادِ مرگ۔ وائے غضب
ہم سے اک باکمال چھین لیا — اے فلک یہ عتاب۔ بےسبب
ارتحالِ ادیبِ کامل سے — فرشِ ماتم ہے آج بزمِ طرب
آنکھ مصروفِ گریۂ پیہم — قلبِ محزوں رہینِ رنج و تعب
ہاتھ ہیں صرف سینہ کوبی میں — لب تشنہ ہیں محوِ شور و شغب
کون دِلّی کی لاج رکھے گا — کون اُردو کا سر دھرا ہے اب
کسکو حاصل یہ شوخی و تمثیل — کسکو معلوم یہ نکاتِ ادب
یعنی اک بات میں کئی پہلو — فقرہ فقرہ لطیف و داد طلب
لب و لہجہ ملائم و شیریں — طرزِ تحریر دلکش و انسب
نئی بندش بچے تُلے الفاظ — صاف آئینے کی طرح مطلب
باوجود اسکے زندہ دل خود دار — اور باوضع۔ صلح کُل مشرب

کہو حیدر یہ مصرعۂ تاریخ
ہو گیا گُل چراغِ بزمِ ادب
۱۳۵۲ھ

حیدر دہلوی

گر پیر نو د سالہ میر د عجبے نیست

مگر

از جناب لسان الملک ریاضؔ خیرآبادی

خان بہادر سید ناصر علی مدیر "صلائے عام" کے لئے "عجبے ہست" ابھی تک ان کی طبیعت اسی طرح جوان تھی جس طرح آغازِ شباب میں۔ ہر کلیئے کے لئے استثنا ہے مگر موت کے لئے نہیں۔ نہ ہو۔ ان کی موت حیاتِ تازہ ہے۔ جس طرف جایئے جس سے سُنیئے۔ اُنہیں کا ذکر۔ جب تک اُردو لٹریچر کو بقا ہے ان کے نام کو بھی۔ جسکا نام کبھی نہ مٹے وہ زندہ جاوید ہے۔ غالبؔ سے زیادہ انشا پردازی میں اُنہوں نے نام پایا۔ غالبؔ اپنی طرز کے موجد تھے، یہ اپنی طرز کے۔ سرسیّد مرحوم اور ان کے متبعین وحوارین و معاصرین نے اِنکا لوہا مانا۔

ساٹھ پینسٹھ برس ہیں انشا کے مختلف دور گزرے ان سے کسی نے مخالفت نہ کی، انتہا یہ کہ شعرا نے بھی ان کو مانا۔ مثال جو صرف بلند فکر شعرا کا حصّہ ہے۔ اس کے وہ بادشاہ تھے، نہ کسی نظم میں ان کا جواب ملیگا نہ نثر میں، اس کے بعد ان کی نازک خیالی و شوخ نگاری، اسلوب بیان، شستگی زبان گو خاص خاص کے حصّے میں بھی آئی مگر ان کم۔ مجھے تو رونا اس کا ہے۔ کوئی میرا مرتبہ داں قدر شناس اس پائے کا باقی نہ رہا۔ مجھ سے محبت کرنے والوں میں مولوی محمد ابوالمنصور صاحب امام فن مناظرہ ان کے والد ماجد بھی تھے۔ میں پہلے دربار قیصری میں مرحوم کا مہمان رہا مگر وہ عالمانہ شانِ تہذیب اور تھی خان بہادر سید ناصر علی کی ادائے وحشت زا اور چیز تھی۔ مذاقِ صحیح و مذاقِ سلیم خان بہادر کا حصہ تھا ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ   افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

مولوی محمد سبحان اللہ خانصاحب رئیس گورکھپور جن کی ذہانت و علمی قابلیت اچھوں اچھوں کو نظر انداز کر دیتی تھی۔ خان بہادر کے والہ و شیدا۔ ایم اے مہدی حسن افتقادی جو اپنے مکتوب سے زندہ بن چکے ہیں انہیں ان کی تقلید نے اپنی طرز کا موجد بنا دیا۔ مگر وہ ان کی طرز کی تقلید نہ کر سکے ؎ ریاضؔ

اے عندلیب ننگ اُڑا میری آہ کا   تقلید میں بھی کچھ ہے ایجاد کا مزا

خان بہادر سید ناصر علی کے اُردو لٹریچر سے "صلائے عام" کے لکھنے والوں نے فائدہ اُٹھایا مگر تمام ملک میں انکی تقلید کوئی نہ کر سکا۔ میں اس موقع پر وہ چند شعر لکھنا چاہتا ہوں۔ جو میں نے دہلی میں لکھے تھے۔ کہ دہلی کا ساقی بھی ریاضؔ آشنا ہو جائے۔ میرے لئے یہی بہتر ہے ؎ ریاضؔ

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا   بلبل ہمیں کہ قافیہ گل بود بس است

میرے اشعار سے معلوم ہو سکے گا۔ ناصر علی کیا تھے اور "صلائے عام" کیا تھا:-

"صلائے عام" سے وسعت بڑھی زباں کیلئے
"صلائے عام" ہی یارانِ نکتہ داں کیلئے

یہ کس کے نام نے لی زبان میں چٹکی
کہ بیقرار ہوئیں شوخیاں بیاں کے لئے

ابھی تو بات بھی کوئی نہ آئی تھی لب تک
اثر نے دوڑ کے بوسے مری زباں کے لئے

ہوئی تھی۔ کاہے کو تاثیر اس طرح بیچین
کسی کے نیم شبی نالہ و فغاں کے لئے

زبانِ خشک کو دعویٰ ہے گلفشانی کا
زباں کے کانٹے بنیں پھول اب بیاں کے لئے

نئے شگوفے کھلانے بہار آئی ہے
بنا ہے رنگ اثر آج ہر فغاں کے لئے

ترقیاں ہیں یہی تو صدائے خندۂ گل
بنے گی نغمۂ نو مرغِ نغمہ خواں کے لئے

شکستِ آبلہ پائی کی بے سکت آواز
فغاں بنے گی جرس ہائے کارواں کیلئے

یہ باغ وہ ہے کہ سینچا ہے خونِ دل سے اسے
بہار بھی ہوئی ایسے بوستاں کے لئے

یہی ہوا جو رہے گی زمینِ گلشن کی
نئے شگوفے کھلیں گے اب آسماں کے لئے

ستارے جتنے ہیں اب وہ رنگ بدلیں گے
بنیں گے پھول وہ دامانِ کہکشاں کیلئے

اُڑیں گے اور بھی اب اونچے نغمہ خوان بلبل
بلند جائیں گے طوبیٰ سے آشیاں کیلئے

بہ فیضِ عام جہاں میں "صلائے عام" کا ہے
فغاں اثر کے لئے ہے اثر فغاں کے لئے

عجب ادائے بیاں ہے عجیب طرزِ بیاں
کہاں یہ حسنِ بیاں غیر کی زباں کے لئے

شعاعِ مہر نمایاں خطوطِ مسطر سے
ضیا فزا ہے ہر اک سطر کہکشاں کے لئے

ہر ایک دل کا سویدا ہے نقطۂ روشن
یہ نور آنکھ کی پتلی کا ہے جہاں کے لئے

اُٹھا کے دستِ نظر سے سب آنکھ میں رکھ لیں
عجیب چیز ہے یہ اپنے قدرداں کیلئے

حروف کی نگہِ نکتہ رس بلائیں لے
نظر فریب ہے ہر نکتہ نکتہ داں کے لئے

رہے گی جان پڑی اس میں ہر سخنور کی
ہر ایک دائرہ ہے دامِ مرغِ جاں کیلئے

ہر ایک صفحہ ہے تختہ۔ زمینِ دہلی کا
ہوئی زمین سببِ فخر آسماں کے لئے

یہ وہ زمین ہے جس پر ہے تاج کا سایہ
وہ سایہ تاج ہے جو فرقِ فرقداں کیلئے

کہو فلک سے کہ جھک جھک کے لے زمیں کے قدم
کہ ہیں زمیں کے قدم آج آسماں کیلئے

اِسی زمینِ مبارک پہ آج ہے دربار
یہی ہے مرجعِ عام آج اک جہاں کے لئے

ہوئے ہیں تخت نشیں آج پنجم جارج
یہ وہ خوشی ہے کہ ہے عید اک جہاں کیلئے

بڑھی ہے دلّی عروس البلاد لندن سے
کہ تخت گاہ بنی ہے یہ شہ جہاں کے لئے

وہ شاہ جو ہے شہنشہ سے بڑھ کے رتبے میں
وہ شہریار جو قیصر بنا یہاں کے لئے

یہ آسماں سے کہو بن کے فرش بچھ جائے
جگہ نکالی ہے ہم نے کچھ آسماں کے لئے

جگہ نہیں کہیں تل دھرنے کی قیامت ہے
وہ تل جو حسنِ فزا ہے رخِ بتاں کے لئے

جگہ نہ کمپ میں باقی نہ شہر میں باقی
کسی سے بھی نہیں کہتا۔ کوئی مکاں کیلئے

قدم جو شاہ کے آئے یہ ہے اثر اس کا
کہ ہر مکاں میں جگہ نکلی کارواں کے لئے

ہر اک مکاں میں ہے ساماں وسیع ہوٹل کا
کہ ہر طرح کا ہے آرام میہماں کے لئے

دلوں میں آنکھوں میں لیتے ہیں میہمانوں کو
بڑے مزے کی سرائیں ہیں کارواں کے لئے

صلائے عام کے صفحے ہیں اُن سے بھی بڑھ کر
جگہ نکالی ہے بزم شہ جہاں کے لئے

اسی کیواسطے نکلا ہے اب یہ نمبر خاص
بڑھائے صفحے کئی وسعتِ بیاں کیلئے

خدا کرے یونہی پھولے پھلے یہ باغِ سخن
خزاں نہ اسکے لئے ہو نہ یہ خزاں کے لئے

ریاض کوئی غزل داس زمیں میں کہو
مگر جو خاص ہو یارانِ نکتہ داں کیلئے

تری گلی سے اٹھے فتنے اک جہاں کیلئے
نہ اک جہاں کے لئے بلکہ آسماں کے لئے

کہے نہ اب کوئی چبھتی ہوئی فغاں کیلئے
کہ آہیں کلنٹے ہیں سوکھی ہوئی زباں کیلئے

چھری نہ تیز کرے کوئی امتحاں کے لئے
بہت ہے نیم نگہ مجھ سے نیم جاں کے لئے

شبِ فراق کے جاگے ہوؤں کو مل جائے
وہ نیند زہر جو ہو ان کے پاسباں کیلئے

بلائیں پیار سے لیں عمر جاوداں نے مری
کچھ اس ادا سے مزے مرگِ ناگہاں کیلئے

لبوں تک آئے نہ جائے یہ عرش تک نہ سہی
تڑپ رہا ہے مرے ساتھ اثر فغاں کیلئے

کسی کی چینِ جبیں پر مجھے ہنسی آئی
ذرا سی تیغ چلی میرے امتحاں کے لئے

ہمارے دل میں کہاں پیاری پیاری ہنس مکھ شکل
وہ آرسی کے لئے۔ یہ غمِ نہاں کے لئے

مری گلی میں وہ آکر مری گلی کا ہوا
قدم زمیں نے بڑی انکے پاسباں کے لئے

اِدھر اُدھر لئے پھرتی ہے بادِ تند کی موج
نئی یہ شاخ ملی مجکو آشیاں کے لئے

نہ رہروانِ عدم چھوٹ کر ملے ہم کو
اُڑائی خاک بہت ہم نے کارواں کیلئے

تم اچھے آئے دلانے فلک کو داغِ جگر
ہمارے پاس ہیں انگارے آسماں کے لئے

وہ دیکھ کر مرے سوتے نصیب کو لوٹے
یہ میٹھی نیند کہاں میرے پاسباں کے لئے

یہ ذرّے خاک کے تو خاک میں ملائیں گے
مرا غبار بہت ہے اِس آسماں کے لئے

قفس میں ہم تھے گھری یاد تو مین بجلی تھی
تڑپ تڑپ کے رہے دونوں آشیاں کیلئے

ملی بھی خضر تو یہ تم سے نیک بندے کو
گناہگار نہ تھے عمرِ جاوداں کے لئے

قفس کے گرد شرر بجلیوں کے ہیں صیاد
یہ تنکے چن کے تھے دیدے آشیاں کیلئے

ریاض کاٹتے ہیں دن ہم اپنی عمر کے یوں
دعائیں مانگتے ہیں مرگِ ناگہاں کیلئے

آہ ناصر علی

رنگِ خوں اشک میں گھر نظر آتا ہے مجھے
آج دامن پہ کلیجہ نظر آتا ہے مجھے

آہ! ناصر علی اب اس دُنیا میں کہاں؟ وہ وہاں ہیں جہاں ہماری آرزوئیں رہا کرتی ہیں! ؎

گئی اُردو کی رونق فراغ کے ساتھ — وہی دم تھا غنیمت، وہ نہیں ہیں

میر ناصر علی کو "مرحوم" لکھنے کو میرا جی نہیں چاہتا کہ اُن کا لٹریچر قطعی غیر فانی ہے! ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ تو

ارضِ تاج (آگرہ) سے ناصر علی کو ازلی نسبت تھی، جس زمانے میں بوڑھے سرسیّد نے علیگڈھ سے "تہذیب الاخلاق" نکالکر اپنے ادبی کارناموں کی دھوم مچادی تھی اُسی وقت یعنی ۱۲۹۶ھ ہجری میں جوان ناصر علی نے آگرہ سے رسالہ "تیرہویں صدی" اس شان سے نکالا کہ:- ؎

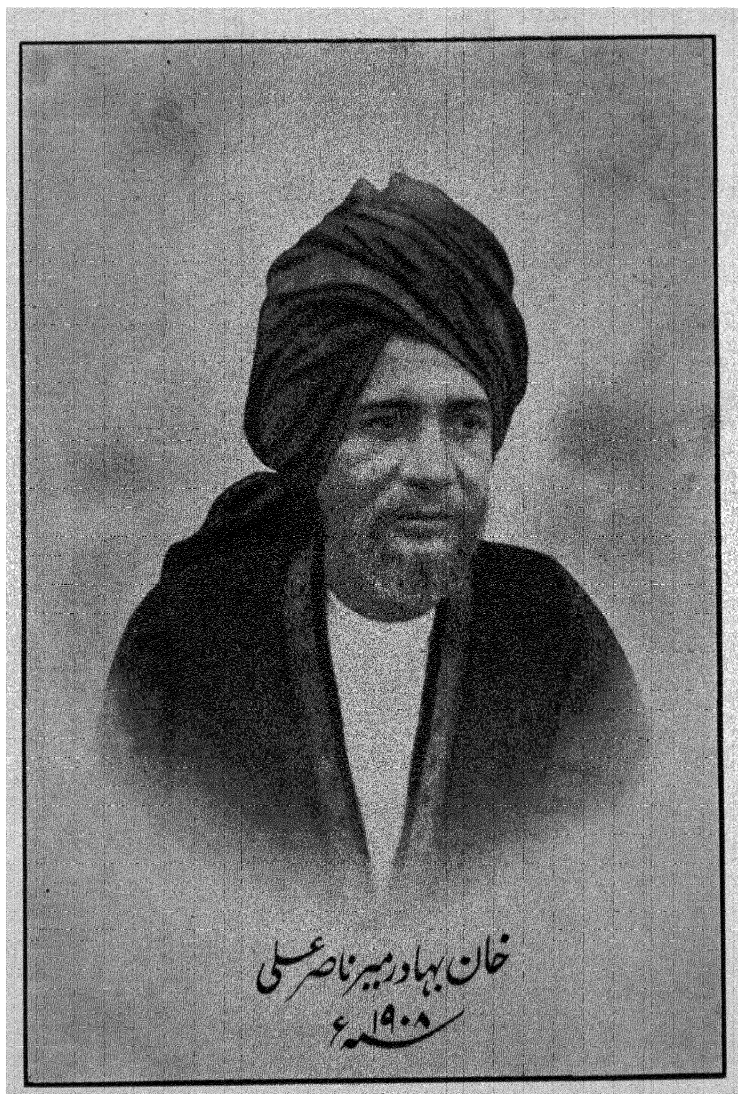
نکلے جدھر سے وہی چرچا ہوا کیا — اس طرح کا جمال ہوا ایسا شباب ہو

یادش بخیر "تیرہویں صدی" میں ناصر علی نے جس طرح دادِ سخن دی اُسے دیکھکر کافرِ "مہدی" کو یہ جواہر پارے اُگلنے پڑے:-

> "تہذیب الاخلاق" کے ساتھ ساتھ آپ نے جس ٹھاٹھ سے دُھواں دھار مضامین لکھے اور سرسیّد کے لٹریچر پر جس سلیقے اور سخن گسترانہ شوخیوں سے آپ نے انتقادات کی لہرائی پیچ یہ ہے کہ وہ اردو لٹریچر کی جان ہیں۔ آج سنجیدگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ میں نہیں جانتا ملک کے نامور اہلِ قلم آپ کے گذشتہ کمالات کی داد دینگے۔ لیکن میں کھُل کر کہتا ہوں کہ آپ نے اُس وقت انشا پردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لئے تھے۔ آپکا اَدبی مذاق اور ایک خاص طرح کا مادۂ اختراعی (اُرجینلٹی) دراصل آپکے ادبیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ موجودہ نسل تمامتر "تہذیب الاخلاق" کے اَدبی دور کی پیدا کردہ ہے۔ جب آپکے لٹریچر کا شباب تھا اور یہیں سے اپنا مرتبہ دیکھ لیجئے۔"

چار پانچ سال بعد جب رسالہ "تیرہویں صدی" بند ہوا تو اس کا قائم مقام آگرہ ہی سے رسالہ "زمانہ" نکلا جس میں ناصر علی برابر اپنے "لطائفِ ادبی" سے دُنیا کو مستفیض کرتے رہے۔

"SAQI"



یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اُردو نثر میں عاشقانہ مضامین لکھنے کے موجد میر ناصر علی ہی ہیں۔ چنانچہ وہ خود رسالہ دبدبۂ آصفی میں ارقام فرماتے ہیں :۔ ؎

"نہیں گمنام میں اہلِ سخن میں ہمرا نالہ ہے نامی انجمن میں"

"رسالۂ دلگداز کے کسی جھگڑے میں ایک دفعہ یہ بحث ہوئی کہ نثر میں عاشقانہ مضامین لکھنے کا موجد کون ہے؟ اس بحث کی وجہ یہ ہوئی کہ صاحبِ "دلگداز" کی طرف سے اس رنگ کے موجد ہونے کا دعویٰ ہوا تھا جس پر رسالہ "ناول" لکھنؤ نے ۱۸۹۳ء میں ایک مضمون لکھا جو اُس وقت تو میری نظر سے نہیں گذرا لیکن اتفاق سے اُس وقت کا ایک رسالہ مضامین اندنوں میرے پاس آ گیا جس میں کسی نے لکھا ہے :۔

"ہمیں خوب یاد ہے کہ اس رنگ کے مضامین سب سے پہلے ہم نے "تیرہویں صدی" کے صفحوں پر تخمیناً بیس پچیس برس اُدھر دیکھے تھے جو اس زمانہ کے لائق نوجوان ناصر علی صاحب دہلوی کے زورِ قلم کا نمونہ تھے جنہیں دیکھکر ہمارے معزز دوست حضرت ریاض (خیرآبادی) نے جو ایک چلبلی طبیعت کے آدمی ہیں اس رنگ کو اُڑایا اور اس کے برتنے میں اپنی فطرتی شوخیوں کے سبب سے خوب ہی پھلے پھولے"۔

اس کے بعد اور ایسی ہی چند واقعاتی باتیں بیان کر کے لکھا کہ :۔

اُن کے (صاحبِ دلگداز) اس رنگ کے موجد ہونے کا دعویٰ اُس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک وہ مذکورۂ بالا واقعات کو غلط نہ ثابت کر دیں۔ (منقول از دلپذیر بسیر بزم نمبر ۶ مطبوعہ مارچ ۱۸۹۴ء صفحہ ۳۵)

میں وہی ناصر علی ہوں جس نے رسالہ "تیرہویں صدی" نکالا تھا۔ مگر نوجوان نہیں رہا اُس وقت کا کوئی آدمی جوان رہا ہو تو میرا قصور۔ جوانی کے ساتھ وہ طبیعت بھی نہ رہی جس کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کا مشغلہ تھا۔ لکھنے کی تو میں نے مدّت سے قسم کھا رکھی ہے مگر پڑھنے کی عادت نہیں گئی۔ میں یہ دیکھکر بہت خوش ہوں کہ جس غرض سے میں نے اُردو میں لکھنا شروع کیا تھا وہ غرض میری آرزو سے زیادہ پوری ہو گئی۔ اب مجھ سے بہت اچھے اچھے لکھنے والے نظر آتے ہیں جن کی نظم و نثر سے اُردو میں جان پڑ گئی ؎

دِر ستان زدم نا حال ہشیاران شود پیدا نہفتم قدر خود تا قیمت یاران شود پیدا"

(از دبدبۂ آصفی جمادی الثانی ۱۲۹۳ھ ہجری)

"زمانہ" بند کرنے کے بعد "نصرت المطابع" دہلی سے دو پرچے "ناصری" اور "افسانۂ ایام" کے نام سے اور نکلے ۱۹۰۸ء میں رسالہ "صلائے عام" دہلی سے شائع کیا جو مرتے دم تک برابر جاری رہا ؎

ادائے خاص سے ناصر ہوا ہے نکتہ سرا   "ضلائے عام" ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

اس کی اشاعت کی نسبت میر صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

جب میں نے ملازمت سے عزلت گزینی اختیار کی تو گو آزادی نصیب ہوئی مگر عادت جو پابندی کی تھی اسلئے رہائی میں جب زنجیریں اُترگئیں تو سامانِ زندگی میں سے کچھ کھویا سا معلوم ہوا۔ اس کے لئے "ضلائے عام" نکالا ؎

زنجیر کا سلسلہ نکالا   تدبیر کا حوصلہ نکالا

یہ سلسلہ گلے کا ہار ہوگیا۔ ع بلبل کجا شود ز حریم چمن جدا؟"

"تیرہویں صدی" اور "ضلائے عام" کے لٹریچر کے متعلق میر صاحب نے جس انداز خاص سے تنقید کی ہے وہ آپ کے سُننے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"جنہیں کوئی اعتراض نہیں ملتا وہ یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ "ضلائے عام" میں "تیرہویں صدی" کی سی شوخ بیانی نہیں۔ سچ پوچھئے تو "تیرہویں صدی" کو میں خود بھول چلا تھا۔ سمجھے ہوئے تھا کہ ایک خیالی بات کا قصہ چار پانچ برس تک چلا۔ بہت چلا۔ اگر کوئی خوبی اُس میں تھی وہ اُس کے ساتھ ختم ہولی۔ "ضلائے عام" کے سامنے "تیرہویں صدی" طبیعت کی محض امنگ کا نتیجہ تھا اب پختہ مغزانِ معانی سے سابقہ پڑا ہے۔ آگے میں دوسروں کا حال اپنی زبان میں ادا کرتا تھا جس طرح ڈرامہ میں ایکٹر دوسروں کے رنج و سُرور کی نقل کرتے ہیں۔ جنگل دیکھا نہیں اور قیس کا پارٹ لے رہے ہیں۔ پہاڑ دیکھا نہیں اور فرہاد بنے بیٹھے ہیں۔ اب میں اپنا حال اپنی زبان سے اس طرح ادا کر رہا ہوں جس میں تصنّع کا نام نہیں۔ جو مجھ پر گذرتی ہے میں جانتا ہوں کہ وہی اوروں پر گذرتی ہوگی، آگے جو جی میں آتا کہہ ڈالتا تھا اور کوئی ناپسند نہیں کرتا تھا۔ اب بہت سوچ کر لکھتا ہوں اور شکایت ہوتی ہے آگے جو نہیں سمجھتے وہ بھی خوش ہوتے تھے۔ اب جو سمجھتے ہیں وہ بھی داد میں کمی کرتے ہیں۔ آگے شوخ بیانی پر چُپ ہو جاتے تھے۔ اب متانت میں بھی عیب نکالتے ہیں۔ آگے جن باتوں کو میں بے سمجھے لکھ دیتا تھا لوگ سمجھ جاتے تھے۔ اب سمجھا کر لکھتا ہوں اور سمجھنے والوں کے لالے ہیں۔ آگے واہ واہ تھی۔ اب آہ آہ ہے۔"

سچ یہ ہے کہ "ضلائے عام" جیسا پاکیزہ رسالہ نکلا۔ داد بھی بہتر سے بہتر ملی پیمبرِ سخن "مہدی" نے جس سلیقے اور سخن گسترانہ شوخیوں کے ساتھ ناصر علی کے لٹریچر کی داد دی ہے ادبِ اردو کو آج تک اُس پر ناز ہے ؎

ہزاروں سے سُنے وہ لفظ لیکن لفظ تھے خالی   تمہاری بات کی شوخی تمہاری ہی زباں تک ہے

میرا دل آج تک اس "تنقیدِ عالیہ" کے مزے لے رہا ہے اور خدا جانے کب تک لیتا رہے گا۔ ترکیب الفاظ

ہی تو ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کوئی دل میں بیٹھا ہوا چٹکیاں لے رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کو بھی اس لطف میں شریک کروں۔ سُنیئے وہ کافر کیا کہتا ہے :-

مُلک میں اچھے لکھنے والے کم ہیں۔ ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آپکے رنگ میں دو سطریں بھی لکھ سکیں۔ مرحوم ریاض (خدا اُسے مدّتوں زندہ رکھے) اور برہم واشہری کے دل سے پوچھئے ناصر علی پھر کہاں ؟

آپ کی زبان اپنے مختص النوع صفات کے ساتھ کسی اور کے بس کی چیز نہیں اور سچ یہ ہے کہ آپ اپنے فن کے اختصاصی (اسپیشلسٹ) ہیں۔

میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافت خیال پاتا ہوں۔ آپکی چشم سخن جہاں "جنس لطیف" اور اُس کے متعلقات کی طرف اشارے کرتی ہو وہ نزاکت خیال کی آخری حد ہے۔

"تیرہویں صدی" میں بہتیرے نشتر ہیں جو آج تک دل میں چبھ رہے ہیں، ابھی ابھی ایک فقرہ نظر سے گذرا :-

"یہ پان اُن کے لئے ہے"

بے اختیار جی بھر آیا۔ اگلے پچھلے قصے پیش نظر ہوگئے۔ پوچھئے تو بتا نہیں سکتا۔ لیکن کچھ تو ہے جو دل پر چوٹ لگی۔ رکھ رکھاؤ اتنا تو ہو۔ ایک چھوٹا سا فقرہ اور عطر زندگی!

بوڑھے حالی جو شاعرانہ جذبات کے ساتھ بھی عورت توخیر "چھوٹے کپڑے" سے گھبراتے ہیں۔ اس قسم کی نزاکت خیال کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن انشا پردازی ان سے کبھی قطع نظر نہیں کر سکتی۔ شوق کی مثنویوں میں سے اگر زوائد کو نکال ڈالئے تو جو کچھ بچ رہیگا فلسفۂ اخلاق کی جان ہوگا ؎

"یادانتی تمہیں دلانے جائیں　　　　پان کل کے لئے بنانے جائیں"

ان سیدھے سادے مصرعوں میں جو کچھ رکھ رکھاؤ ہے کسی رازدار فطرت سے پوچھئے۔ کیا دُنیا کی شاعری اس کی نظیر پیش کرسکتی ہے ؟ یورپ میں جو آج بڑے پایہ کے لکھنے والے ہیں اُن میں مذاق حُسن پرستی اس قدر رچ گیا ہے کہ قریب قریب اُن کی ہستی کا ایک جزو ہو رہا ہے۔ عورت جسے "خواب طفلی اور آرزوئے شباب" کہیئے

"ہر بات تری فسانۂ حُسن!"

ہیئت اجتماعی (یعنی سوسائٹی) کی روح رواں ہو رہی ہے جس سے کوئی شائستہ لٹریچر دست بردار نہیں ہو سکتا۔ آپ ان نزاکتوں سے خوب واقف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ :-

"عکس رُخ موتیوں کے دانوں میں"

"صنف نازک" آپکے دائرۂ تحریر میں کسی نہ کسی حیثیت سے آہی جاتی ہے"

اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناصر علی کی نازک خیالی و پاکیزہ بیانی کے چند موتی، جو "صلائے عام" کے صفحات پر بکھرے پڑے ہیں، انتخاب کرکے پیش کروں۔ جنہیں دیکھنے کے بعد ہی لوگوں کو نظر آئیگا کہ مہدی مرحوم نے ناصر علی کے دل فریب لٹریچر کا کسقدر گہرا مطالعہ کیا ہے اور کتنی صحیح رائے دی ہے ؟

"عورت جب مُنہ پھیر کر چلنے کے لئے اُٹھ کھڑی ہو تو اُس کے یہ معنی ہیں کہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوڑ کر دامن پکڑے"

"عورت کے لئے اس قدر بس نہیں ہے کہ مرد کا دل ہاتھ میں رکھے بلکہ جب ہاتھ آجائے تو تنگ رکھے کہ یہی نسخۂ تسخیر ہے"

"کیلے مے نوشی عیش میں داخل نہیں۔ کسی غارت گرِ دین آفتِ ہوش کے ساتھ اگر یہ لُطف میسر ہو تو ایسے میں رحمتِ الٰہی پر ایمان نہ رکھنا ضعفِ عقائد میں داخل ہے"

"کسی کے خیال میں اپنی جان کو خوش رکھنا بُرا نہیں۔ خاصکر ایسی محبت جس میں یار کا مسکرانا یہ بتائے کہ ع

"نہ دیکھیو اسوقت میں ہوتی ہوں بدنام"

"محبت وہ چیز ہے جو ساز و سامان کی محتاج نہیں۔ محبت کے لئے ایک اکیلا دل چاہئیے"

"عورت کیسی ہی آوارہ کیوں نہ ہو مگر پارسائی پر جان دیتی ہے"

"حسینوں کو شاعروں سے شاعر مزاج زیادہ پسند ہیں۔ انکے لئے موزونیٔ طبع بے کار ہے ان کو اس خیال میں مزہ آتا ہے کہ کسی کو ہمارا خیال ہو اور ہمیں کسی کا"

"وہ حسین بھولنے کی چیز نہیں جو لڑکپن سے نکلتی جوانی میں کسی کے خیال میں ہو۔ ایسی عورت کو اپنے چاہنے والے سے یہ سُننے کی تاب نہیں کہ رات زیادہ گئی ہے۔ اس کی ایک رات الف لیلہ کی ہزار رات سے بہتر ہے!"

"یہ عورت جو دامن کشاں جارہی ہے اس کو آپ کی بے التفاتی کا رنج ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ آپ اور کسی طرف نہ دیکھیں"

"حسین عورت جب کسی سے بچ کے نکلے تو اُس کا اسقدر نقصان نہیں جسقدر کہ اپنا ہے"

"آپ یہ نہ سمجھیں کہ انسان عورت سے بازی لے جاسکتا ہے۔ مرد اگر کبھی عورت کو دغا دے تو بھی عورت ہی کا مارا سمجھیئے"

"تمام عالم میں حسینوں کی کم سنی سے زیادہ کوئی چیز دل فریب نہیں۔ جن کی کُھلی یا بندھی سر کی چوٹیاں درازیِ عمر کا جواب ہیں"

"خُدا نے عورت کو بالطبع عیش پسند پیدا کیا ہے۔ عورت کے لئے عیش سلطنت کا جلوس ہے"

"عورت کے پاؤں فرشِ مخملین چاہتے ہیں۔ مرد کے پیر کانٹوں کے لئے بنے ہیں۔"

"مصائب میں عورت کا حال شاخِ گل کا سا ہے جو آندھی میں جُھک جاتی ہے اور جہاں ہوا تھمی پھر سیدھی ہو گئی۔"

"عورت کا دماغ ہمیشہ بہار کا نمونہ سمجھیئے جس میں خزاں کو دخل نہیں۔"

"عورت جس بات کا ارادہ کرے کر گذرتی ہے۔ اس لئے محبت میں زیادہ لطف اُس محبت کا ہے جو عورت کی طرف سے ہو کہ اگر عورت چاہے تو سو بہانہ سے ملیگی۔ وہی نہ چاہے تو ملنا معلوم

ع یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے"

"کہتے ہیں کہ محبّت میں ہوش نہیں رہتا۔ میری رائے میں مرد کو ہوش نہیں رہتا۔ عورت کو ہوش رہتا ہے۔"

"عورت کو معلوم ہے کہ میں اکیلی بے کار ہوں۔ میری زندگی کا مدار دوسرے پر ہے۔ جو غیر جنس (مرد) ہے۔"

"عورت جس کی عملداری میں رہتی ہے اُسی پر حکومت کرتی ہے۔"

"یہ بات عورت کی عادت میں داخل ہے کہ مُنہ چُھپائے اور حسنِ التفات کا دعویٰ کرے۔"

"عورت کو چُپکے ہی چُپکے گھر میں جان دیتے سُنا۔"

"مرد عشق کرتے ہیں مگر عورت عشقِ مجسّم ہے۔"

"عورت میں محبّت کے سوا کسی چیز کی قابلیت ہی نہیں۔"

"محبّت بغیر عورت جی نہیں سکتی۔ مرد اور طرح بھی جی سکتا ہے۔"

"عورت کے دل میں محبّت جسقدر جلد اثر کرتی ہے اُسی قدر دیرپا بھی ہے۔"

"عورت کے لئے نری پارسائی کافی نہیں۔ دل رُبائی اور دل فریبی بھی ضرور ہے۔"

اس اندازِ بیان کا کیا کہنا؟ جو ہماری زبان (اُردو) پر ختم ہے۔ ناصر علی کے لٹریچر میں ایسے نشتروں کی کمی نہیں۔ ہائے کیا طبیعت پائی تھی؟ ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میں جس "ادبِ لطیف" پر مٹا ہوا ہوں مولانا شرر لکھنوی اور میر ناصر علی دہلوی کے بعد اس کی جان ہی سے لالے ہیں ؎

سودا کے زلفِ یار کا اب سلسلہ ہے گُم آباد تھا یہ کوچہ دلِ ناتواں تلک

۱۹۰۹ء سے "صلائے عام" کی بدولت میر ناصر علی سے میرے تعلقات خاص ہو گئے۔ کئی مرتبہ اُن کے بلانے پر میں دہلی گیا اور "ناصر منزل" میں مہمان رہا۔ کہہ نہیں سکتا۔ کس قدر پُر لطف شاعرانہ صحبتیں رہیں؟ اب صرف "یادِ ایام" باقی ہے ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ افسوس تمکو میر سے صحبت نہیں رہی!

ایک ادبی صحبت، جس میں دلّی کے مشاہیرِ ادب جمع تھے میر ناصر علی کا یہ کہنا مجھے قیامت تک یاد رہیگا:-

"دلگیر کی نظر سے دُنیا کا کوئی حُسن نہیں بچتا"

ہاں خوب یاد آیا، اِسی طرح ایک دن الہ آباد میں حضرت اکبر کی خدمت میں حاضر تھا۔ شعر سُنتے سُنتے جب مینے اس مطلع کی بے ساختہ داد دی :-

"کیا شان ترے جمال میں ہو ہر وقت زمانہ حال میں ہے"

اُس وقت حضرت اکبر نے بھی ازراہِ محبّت ارشاد فرمایا تھا:-

"دلگیر، تمہاری نظر سے گاؤں کی کوئی دوشیزہ نہیں بچتی"

حیران ہوں کہ میرے ایسے قدردان کہاں سے آئینگے؟ اب کہاں لوگ اس طبیعت کے؟

میر ناصر علی کے بہت سے پاکیزہ و دلکش خطوط میرے پاس موجود ہیں جن میں سے آج صرف ایک خط پیش کرتا ہوں۔ اس کے پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ میر ناصر علی مجھ سے کس قدر اُنس و شفقت رکھتے تھے :-

"عزیز دلگیر! آپ نے رسالۂ نقّاد نکال کر اُردو پر جو احسان کیا تھا وہ کوئی بُھول نہیں سکتا۔ اب اُسی قدر اُس کے بند ہوجانے کا افسوس ہے۔ لیکن آپ کی معلوماتِ علمی اور کمالاتِ ادبی سے مُلک کو فائدہ پہونچانے کی یہ تدبیر ہے کہ آپ "صلائے عام" کو اپنا رسالہ سمجھیں۔ ضعیفی کی وجہ سے مجھ سے لکھا پڑھا نہیں جاتا۔ آپ جوان ہیں اور تیز طبع۔ لکھنے پڑھنے سے غافل ہونا مناسب نہیں۔ آپ ایک خاص اسٹائل کے مالک ہیں۔ آپکو جس طرز پر لکھنا پسند ہو لکھا کیجئے۔ نظم ہو یا نثر۔ لیکن آپ کی نقّادی کے دُنیا پر سِکّے بیٹھے ہوئے ہیں۔ "صلائے عام" کو آپ کی نقّادی کی زیادہ ضرورت ہے۔

آپ نے یہاں جب تشریف لائے تھے جناب مائل کے دو ایک پُر لُطف شعر مجھے سُنائے تھے میں مائل کے کلام کا قائل ہوں۔ مائل کے دو چار شعر جو آپ کو یاد ہوں مجھے لکھ بھیجئے۔

"خاصکر وہ شعر مجھے یاد نہیں کہ میکدہ کے مسائل[1] میں مائل کا فتویٰ مستند ہے یا قریب قریب اسی مضمون کا شعر تھا۔ جی چاہے اور فرصت بھی ہو تو کبھی دِلّی آیئے۔"

نیازمند ناصر علی۔ فراشخانہ۔ دہلی۔ ۸؍ اگست ۱۹۲۶ء

آہ! اس حادثۂ جانکاہ پر کہاں تک رووٗں؟ ناصر علی کی موت اپنی نوعیت کے لحاظ سے کسی طرح لائق صبر نہیں ؎ فائدہ نالہ و شیون سے نہیں کچھ بھی نیاز بین کرنے سے کہیں رنج بھی ہوتا ہے کم

خدا مرحوم کی قبر کو عنبریں کرے اور غریب اُردو کو صبرِ جمیل کی توفیق بخشے۔

[1] حضرت مائل دہلوی کا یہ لطیف مطلع میں نے سُنایا تھا۔ دیکھئے کیا کہا ہے :- ؎

مفتیِ میکدہ سب کہتے ہیں مائل مجھکو یاد ہیں بادہ کشی کے وہ مسائل مجھکو

دلگیر۔

یہ واقعہ ہے کہ میر ناصر علی اُردو لٹریچر کی ناک تھے، اور ان کی موت در اصل اُردو کی موت ہے! بہر تقدیر جس رنگ سخن کا ہیں دلدادہ اور جس طرز بیان کا شیفتہ ہوں، ناصر علی کے بعد ختم ہے ؎

ترے بعد اکبر کہاں ایسی نظمیں؟
وہ دل ہی نہ ہونگے کہ یہ آہ نکلے!

شاہ دلگیر جمالی اکبرآبادی

"ناصر علی نظیریٔ ہندوستان بود"

بادہ کشانِ شعر و ادب مضطرب سے ہیں — پیرِ طریقِ بادہ پرستی نہیں رہا
وہ تھا جو لباسِ ادب میں پیامِ ہوش — وہ آشنائے لذتِ مستی نہیں رہا
جسکے قلم میں قوتِ تخلیق و نظم تھی — وہ عالمِ لطائفِ ہستی نہیں رہا
اب کون ہے جو دادِ خیالات و شعر دے — دلدادۂ خیال پرستی نہیں رہا
تھیں جسمیں رنگِ شعر و ادب کی لطافتیں — وہ ایک نقشِ رونقِ ہستی نہیں رہا

یک بندۂ خدا و خدائے زبان بود
ناصر علی نظیریٔ ہندوستان بود

شاہد صدیقی اکبرآبادی

میں اور میر ناصر علی (مرحوم)

(خان بہادر) میر ناصر علی سے میرا تعارف (مرئی نہیں بلکہ قرطاسی) اوّل اوّل اب سے ۲۳ سال قبل ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا۔ "صلائے عام" کا شباب تھا اور میرا بھی لیکن اس فرق کے ساتھ کہ میں اس کا پرستار تھا اور وہ میرا معبود خیال۔ یہانتک کہ اس کا انتظار بھی ایک مستقل لذّت ہوا کرتا تھا چہ جائیکہ اس کا مل جانا کہ پھر تو فرطِ شوق میں وہی "ہاتھ لگائے نہ بنے" کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔

میر ناصر علی کی تحریر کا اثر مجھ پر کیا ہوتا تھا اور کیوں، اُس وقت تو میں اس سُکر دمخموی کا کوئی سبب متعین نہ کر سکا تھا لیکن اب میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا اصل راز صرف یہ تھا کہ قلم سے لکھنے والے تو بہت ہیں لیکن دل سے لکھنے والا صرف ایک ناصر علی ہی تھا!!

وہ اُن کے ہلکے ہلکے فقرے جن میں مزاح و فلسفہ دونوں انتہائی اعتدال کے ساتھ ملے ہوتے تھے حقیقتاً تیر و نشتر کا کام دیتے تھے اور ہر شخص بقول غالب یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا تھا کہ :-

"گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

جو کچھ وہ لکھتے تھے بالکل بیساختہ لکھتے اور اس کا ثبوت اُن کی پرائیویٹ تحریروں سے مل سکتا ہے کہ اگر آج اُنہیں شائع کر دیا جائے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ "صلائے عام" کا اقتباس نہیں ہے میں تو مہینے میں دو چار خط ان کے نام زبردستی صرف اس لئے بھیجا کرتا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ جواب ضرور دینگے اور میں اُن سے لطف اُٹھاؤنگا۔

مرحوم مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے اور میرے مضامین نظم و نثر کو حد درجہ معرفانہ الفاظ کے ساتھ شائع کیا کرتے تھے جس سے اُن کا مقصود صرف میرا حوصلہ بڑھانا تھا، ورنہ ظاہر ہے کہ میں کیا اور میرے مضامین کیا؟

میر ناصر علی چونکہ افادی (UTILITARIAN ——) تھے اس لئے اُن کی انشاء میں ایک خاص کیفیت مزاح و تفاؤل (HUMOUR & OPTIMISM ——) کی پائی جاتی تھی جو فطرت انسانی کے لئے بہت زیادہ قابلِ قبول ہے۔

افسوس ہے کہ فطرت نے ایک ہی شخص اس رنگ کا لکھنے والا پیدا کیا، اور اُسی کے ساتھ وہ رنگ ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔

نیاز فتحپوری

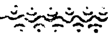
میر ناصر علی خان بہادر دہلوی مرحوم

(از جناب مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی)

اگر سال وماہ کی بابت آپ مجھ سے سوال نہ کریں۔ جنہیں یاد رکھنے میں میرے حافظہ نے کبھی میرا ساتھ نہیں دیا۔ تو اندازاً آپ کو بتا سکتا ہوں کہ دیوانِ غالب اردو میں نے اس زمانہ میں پہلی بار پڑھا تھا۔ جس زمانہ میں اُسکا سمجھنا تو درکنار غالباً میں نہ صحیح پڑھ سکتا تھا نہ اُس کی فارسی تراکیب کو بیک وقت صحیح طور پر ادا کر سکتا تھا۔ اور حیران تھا کہ لوگ کیوں ذوق کے ساتھ غالب کا نام بھی لیتے ہیں۔ حالانکہ ذوق کو "ہم بھی سمجھ لیتے ہیں" اور غالب ظالم صحیح پڑھا بھی نہیں جا سکتا۔ تاہم اتنا ضرور یاد ہے کہ غالب کے دیوان میں یہ شعر بھی اسی زمانہ میں پڑھا تھا ؎

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا — صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

یہ دعویٰ تو مشکل ہے کہ یہ شعر حافظہ کا اُسی وقت کا سرمایہ ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ "صلائے عام" کی ترکیب اسی مطالعہ کی یادگار ہے۔



اس کے بعد دوسرا دور وہ آیا کہ ایک دن اتفاقاً میں نے اپنے اُستاد اور حقیقی ماموں حضرت مولنٰنا محمد نواب خاں صاحب ثاقب قبلہ مالیر کوٹلوی کے ہاں ایک بہت خوبصورت چھپا ہوا رسالہ دیکھا جسکا ٹائیٹل بہیج رنگین اور سُرخ و سبز رنگ کے نقش ونگار سے آراستہ تھا۔ اس میں کیا لکھا ہوا تھا۔ یہ تو مجھے یاد نہیں لیکن ایڈیٹر کا نام اس اہتمام کے ساتھ لکھا ہوا تھا کہ جسے فراموش کیا جانا ممکن نہ تھا۔ یعنی "باہتمام میر ناصر علی خان بہادر" رسالے کے نام سے غالب کا مندرجہ بالا شعر یاد آ گیا۔ اور ایڈیٹر کے نام کے ساتھ "خان بہادر" دیکھکر ذہن میں آیا کہ اچھا "نواب صاحبان" بھی ایسے علم دوست ہوتے ہیں جو رسالے شائع کیا کرتے ہیں۔ "نواب صاحب" کا تصوّر "خان بہادر" کے ساتھ اس لئے آیا کہ ابھی تک ہم نے نوابوں کو ہی خان بہادر کہلاتے سُنا تھا۔ اور حیرت یہ تھی کہ کسی نواب کہلانے والے کو اتنک علم سے دلچسپی لیتے نہ دیکھا تھا۔ خان بہادر کی "سیاسی" یا برطانوی حکومت کے ظلِ ہمایونی میں اہمیت حاصل ہے۔ اس سے بھی ہم واقف نہ تھے۔ رسالے کے نام سے یہ تو پتہ لگا کہ "صلائے عام" کی ترکیب اجنبی نہیں کیونکہ غالب کے دیوان میں موجود تھی مگر اس میں کیا کیا لطافتیں اور ادبی محاسن وحقائق پوشیدہ ہیں ان تک دل ودماغ تنگ کی رسائی نہ تھی۔

تیسرا دور وہ آیا کہ ہم ادبی دُنیا میں قدم رکھ چکے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا نہ صرف شوق ہی پیدا ہو چکا تھا بلکہ پڑھنے اور پڑھتے رہنے کے ساتھ لکھنے اور لکھتے رہنے کا شوق بھی روز افزوں ہو رہا تھا۔ مُلک کے

ایک مشہور قصبہ میں دینی تعلیم کے حصول میں مشغول تھے۔ وہاں ایک منارہ بھی تعمیر ہو رہا تھا اس کے ساتھ بہت سی بشارات قدیمہ کا انطباق کیا جاتا تھا اور اس کی تکمیل پر یقین دلایا جاتا تھا کہ بہت سی آسمانی برکات کا نزول ہوگا۔ اس زمانہ کے خیالات کے لحاظ سے ہم بھی "آنے والے زمانے" کی برکات لامتناہیہ کی روحانی سیر سے سرمست رہا کرتے تھے۔ جس مسجد میں یہ منارہ تعمیر ہو رہا تھا وہ بڑی مسجد تھی اس میں روزانہ قرآن پاک کا درس ہوا کرتا تھا۔ ہم نہ صرف درس ہی کے اوقات میں وہاں موجود رہتے تھے بلکہ ہم نے اس منارہ کی ابتدائے تعمیر سے اپنے دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ اس کے مکمل ہونے تک ہر روز اس مسجد میں آئینگے اس منارہ کو تدریجی طور پر بلند ہوتا دیکھیں گے۔ اور زیارت منارہ سے ایک دن بھی ناغہ نہ کرینگے۔

منارہ بنتا رہا اور ہم ہر روز اپنے عہد کے مطابق منارہ پر چڑھتے اور کچھ وقت وہاں بیٹھکر کام کرنے والوں کو کام کرتے دیکھتے اور اُن سے باتیں کیا کرتے تھے۔ منارہ تکمیل پا گیا۔ سفیدی ہو گئی۔ اوپر کی منزل مکمل ہو گئی اور فرصت و تنہائی کا خاصہ وقت منارہ کی اوپر کی منزل پر غور و خوض مطالعہ و نظارہ فطرت و قدرت میں صرف ہونے لگا۔

اسی زمانے میں "صلائے عام" کا ایک خاص نمبر میرے ہاتھ لگا۔ کیسے؟ صحیح طور پر تو یاد نہیں ہاں ہم رسالہ لے کر موقع پا کر عالمِ تنہائی میں مسجد میں چلے گئے۔ جب رسالہ پڑھنے لگے تو اس میں "صلائے عام" کے ایڈیٹر حضرت میر ناصر علی خان بہادر مرحوم کا ڈاکٹر ٹیگور کی مشہور کتاب "گیتا نجلی" کے انگریزی ترجمہ پر ریویو تھا۔ ہم نے ریویو پڑھنا شروع کر دیا۔ میر صاحب قبلہ کا ایک ایک لفظ جادو بنکر دل پر اثر کرتا چلا جا رہا تھا ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ اور برمحل استعمال کیا ہوا ایک ایک شعر وہ اعجاز اور انشاء اردو کا وہ معجزنما کرشمہ تھا کہ دل بے تاب ہو گیا۔ حتیٰ کہ ہم ریویو کے اُس حصہ پر پہنچے جہاں میر صاحب مرحوم نے انگریزی گیتان جلی کے پبلشر کا وہ قول نقل کیا ہے جس میں اُس نے اقرار کیا ہے کہ جب وہ کتاب کا مسودہ ریل میں بیٹھا پڑھ رہا تھا تو اس پر سرمستی و کیف کی یہ حالت طاری ہوئی کہ وہ اپنے جذبات مسرت کو چھپانے کے لئے ریل میں پوشیدہ جگہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو گیا تا کہ کتاب کے مطالعہ سے جو کیفیت اُس پر طاری ہو رہی تھی اُسے کوئی دوسرا دیکھکر ان کی مسرت و اضطراب کا کوئی اور ہی مفہوم نہ لے اُڑے۔

میر صاحب مرحوم کی عبارت سے میں بھی مسحور تو ہو ہی چکا تھا۔ جب اس واقعہ پر پہونچا تو خود میری بھی یہی حالت ہوئی کہ مجھے اپنے گرد و پیش دیکھنا پڑا کہ کوئی میری اس مضطربانہ حالت کو دیکھ تو نہیں رہا کیونکہ میری حالت بھی ایک ایسے آدمی کی سی ہو چکی تھی جو مسرت و خوشی کے عالم میں ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ میری کیفیت

اِس مقولہ کے مصداق تھی کہ۔ "گہہ خنداں وگہہ گریان چوں طفل بخواب اندر"
میں نے نہ چاہا کہ لوگوں کو اپنی حالت دیکھکر خیال آرائیاں کرنے کا موقع دوں اِس لئے اُٹھا اور قریباً دوڑتا ہوا منارہ کی اوپر کی منزل پر پہنچ گیا اور تنہائی میں بیٹھکر پھر نئے سرے سے میر صاحب کا وہی مضمون پڑھنے لگا۔ اب مجھ پر ایک بے خودی کا عالم طاری تھا۔ اور ہنسنے ۔مسکرانے۔ قہقہہ لگانے میں بھی مجھے باک نہ تھی کہ وہاں تنہائی تھی۔ دُنیا سے الگ آبادی کی سطح سے بہت اونچا بیٹھا تھا۔ شراب ادب کا پیالہ نہیں شراب ادب کی صراحی میرے قبضہ میں تھی۔ گھونٹ گھونٹ پیتا تھا اور پیتا چلا جاتا تھا۔ مزے لیتا تھا اور مست ہو ہو کر جھوم رہا تھا۔ کیونکہ ع واں پر نہ تھا مخل کوئی باعث حجاب کا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ میں اودھ کے تمام نامور ادیبوں سے علمی طور پر روشناس ہو چکا تھا۔ اگر ان کی تمام کتابیں نظر سے نہیں گزری تھیں تو کم وبیش ہر ایک کی کتابوں کا معتدبہ حصہ میرے مطالعہ آچکا تھا۔ حیران تھا کہ اب تک میں صاحبِ "صلائے عام" کے ادبی خزانوں سے کیوں بے نصیب رہا۔ واقعہ یہ تھا کہ اس ایک ہی مضمون کے مطالعہ سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میر ناصر علی خان بہادر اُردو ادب و انشار کے فرمانرواؤں میں صاحب امتیاز و عظمت وشان۔ فرماں روا ہیں۔ اور اُردو دانوں کی یہ بے نصیبی ہے کہ وہ اس ادیب سے اتنا متمتع نہیں ہوئے جتنا کہ ان کو ہونا چاہیئے اور اس قدر خوشہ چینی نہیں کرتے جس قدر کہ انہیں کرنی چاہیئے۔

اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ "صلائے عام" کا کوئی پرچہ کسی بھی مناسب ذریعہ سے ملنے کی اُمید ہوا ور میں نے اس کا دریوزہ نہ کیا ہو اور بھوکے آدمی کی طرح بے تابانہ اسکا مطالعہ نہ کیا ہو۔

اب میری زندگی میں مذہبی لحاظ سے ایک انقلاب آیا۔ مجھے اپنا پہلا مذہبی وطن چھوڑنا پڑا حالات مجھے دہلی میں لے آئے۔ آپ خود تصور کر لیجئے کہ کون شخص ہے جو دلّی میں رہے اور موقع اور فرصت ہوتے ہوئے جامع مسجد دہلی کا طواف شام کے وقت نہ کرے۔ میرے لئے موقعہ بھی تھا اور فرصت بھی۔ ہر روز شام کے وقت کام دھندے سے فارغ ہو کر کسی دوست آشنا کے ساتھ یا تنہا جامع مسجد کی طرف جاتا اور خدا جانے کتنے چکّر لگاتا اور یہاں وہاں مداریوں۔ حکیموں۔ گا کر کتاب بیچنے والوں وغیرہ وغیرہ کے اکٹھے کئے ہوئے مجموں میں کھڑے ہو کر کیسی کیسی تقریریں۔ کیسے کیسے تماشے اور کیسے محاورے۔ لطائف اور لغویات کو سُنتا دیکھتا اور اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پڑا اٹکتا پھرا کرتا تھا۔ جب ذوق مجمع پورا ہو چکتا تو ملائی کی قلفی والوں۔ چاٹ والوں۔ کباب والوں۔ فالودے والوں کے سامنے سے بے پروایانہ

نکل کر ان چیزوں سے مجھے کبھی زیادہ رغبت نہیں رہی مسجد کی مشرقی سمت پر ایک پرانی کتابوں والے کی "یعنی دوکان" پر پہنچ جاتا اور وہاں بیٹھکر گھنٹوں کتابوں کی اُلٹ پلٹ میں لگا رہتا اور اچھی کتاب پاکر خرید لیا کرتا تھا۔

ایک دن میں اسی طرح کتابوں کی اُلٹ پلٹ میں مصروف تھا کہ ایک خوشگوار آواز نے مجھے اپنی طرف ملتفت کر لیا۔ آواز کانوں کو بھلی معلوم ہوئی اور بولنے والے کی صورت پر نظر پڑی تو اتنی نورانی ایسی بھولی اور ایسی اچھی تھی کہ دل نے کہا کتاب کو بند کرو اور اسی صورت کو دیکھو اور انہی بزرگ کی باتیں سُنتے رہو۔ جب آواز سُنکر میں کچھ حیران سا ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ تو دیکھا کہ درمیانے قد کے ایک بوڑھے بزرگوار ہیں۔ جسم بھرا ہوا ہے، رنگت جوانی میں سفید رہی ہو تو ہو مگر اس وقت رنگ گندمی تھا چہرہ گول تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور بادامی تھیں مگر عجیب انداز سے بند ہوتی اور کھلتی تھیں۔ تمام چہرہ سنجیدہ ہوتے ہوئے تبسم زار تھا۔ کبیدگی۔ اور مرارت تو گویا اس نورانی چہرہ کو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ اگر اختیار کی جاتی تو شاید بر ایامال ثابت ہوتی۔ ماتھا کھلا ہوا۔ ناک موٹی نہ تھی۔ دانت قریباً غائب تھے۔ ڈاڑھی بالکل سفید مگر خشخاشی تھی۔ سر کے بال بھی سفید۔ مگر چھوٹے چھوٹے۔ سر پر سفید گول ٹوپی۔ کھلی آستینوں کا فلالین کا ملیاکرتا سفید کھلے پائچوں کا پاجامہ۔ دیسی نری کا معمولی قسم کا جوتا شاید اُس کی ایڑی بھی بیٹھی ہوئی تھی، یاد نہیں کہ ہاتھ میں چھڑی تھی یا نہیں۔ سر کسی قدر آگے کو جھکا ہوا، آواز میں نہ صرف مٹھاس تھی، بلکہ ایک خاص قسم کی جھنکار سی تھی۔ لفظوں کا کیا کہنا۔ لہجہ کا کیا پوچھنا، ایک انگریزی کتاب کا مول تول ہو رہا تھا کتاب فروش نے ایک قیمت کہی۔ صاحب موصوف نے کچھ اور کہا۔ مگر فیصلہ کُن انداز میں اور کتاب فروش نے خوشی سے وہی کم قیمت قبول کر لی جو موصوف نے فیصلہ کن طریق پر پیش کی تھی، مجھے گفتگو کرنے والے کی ہر ادا پر حیرت تھی اس انداز خطاب پر اور حیرت تھی، دہلوی کتاب والے کے اس انداز سے صاحب موصوف کی پیش کردہ قیمت پر بیک قدم راضی ہوجانے پر تعجب تھا کہ دلّی والوں کو کبھی خرید و فروخت میں اس طریق سے ایک ہی بات پر راضی ہوتے نہ دیکھا تھا۔ جب میں نے حیرت سے کتاب فروش کو دیکھا تو اُس نے مجھے چُپ رہنے کو اشارہ کیا۔ میں مزید حیران ہو کر خاموش ہو رہا۔ ان بزرگوار نے جو کتاب اُس وقت خریدی تھی۔ وہ مغربی افسانوں کی انگریزی تاریخ کی کوئی ایک جلد تھی۔ اور جلد کے کپڑے کا رنگ گہرا آسمانی تھا۔ جب وہ بزرگوار تشریف لے گئے۔ تو مجھے حیران اور مستفسرانہ انداز سے اپنی طرف دیکھتا پاکر کتاب فروش صاحب نے فرمایا کہ آپ شاید اِن سے واقف نہیں۔ جب میں نے اپنی بے علمی کا اقرار کیا تو اُس نے بتایا کہ آپ خان بہادر میر ناصر علی صاحب ایڈیٹر "صلائے عام" دہلی ہیں۔ یہ سُنتے ہی میں اُچھل پڑا۔ اور میں نے کہا کہ کاش آپ پہلے بتاتے تو میں انکی خدمت میں اپنی نیازمندی کا اظہار تو کر لیتا۔ کتاب فروش بولا آپکی طرح اِن کا بھی ہر روز یہاں ایک پھیرا ہوتا ہے۔ اگر آج نہیں تو کل ملاقات کیجئے۔

نام اور خطاب کی ترکیب و اہتمام اور رسالہ کی اشاعت اور آپ کا اندازۂ خطاب یہ بتایا کرتا تھا کہ موصوف بڑے کرّ و فر سے مکان سے باہر نکلتے ہوں گے۔ لیکن جب آپ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ اور عالم ہے اور یہ اور۔ میرے دل کی پوچھئے تو مجھے ان کی یہ وضع و قطع اتنی بھلی معلوم ہوئی کہ اس کا الفاظ میں بیان ہونا ممکن نہیں۔ میں نے ان کو ان کی وضع و قطع کے لحاظ سے پہلے روز ہی سمجھ لیا کہ آپ ادب و انشا ہی میں گم ہیں، دنیا کی ظاہرداریوں اور بناؤ اور ظاہری رکھ رکھاؤ سے آپ کی وضع و قطع کو کوئی تعلق اور واسطہ نہیں۔

میں نے کتاب فروش سے پوچھا کہ یہ کس قسم کا سودا تھا جو آپ نے میر صاحب سے کیا۔ وہ بولے کہ میر صاحب دوسرے خریداروں کی طرح سے نہیں اس لئے ہماری روش بھی آپ سے دوسروں سے جداگانہ ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے۔ بولے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک قیمت مانگتے ہیں میر صاحب اسے زیادہ بتا کر اس سے کم قیمت فرماتے ہیں اور اسے ہم خوشی سے بے چون و چرا قبول کر لیتے ہیں اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ پرانی کتاب یا ایسی پرانی چیزوں کے ڈھیر میں سے کوئی ایک چیز آپ پسند فرما کر اس کی قیمت دریافت فرماتے ہیں اور ہم اس چیز کی قیمت اپنی خرید کے مطابق کوئی ایک متعین کر کے بتا دیتے ہیں۔ آپ یا تو ہماری بتائی ہوئی قیمت یا اس سے زیادہ یہ کہہ کر بھی دید یا کرتے ہیں کہ تم اسے کیا جانو کہ یہ کیا چیز ہے، بتایئے ایسے خریدار سے ہم کمی و بیشی قیمت پر کیا گفتگو کریں۔

ہم تو پہلے ہی شیوہائے ناصری کے قتیل ہو چکے تھے۔ اندازِ خریداری اور نوادر کی یہ قدر شناسی دیکھکر اور مسحور و مقتول ہو گئے۔ اب دوسرے دن کا انتظار ہونے لگا۔

میں دوسرے دن جب اُسی کباڑی کی دوکان پر پہونچا تو ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی کتاب اُٹھا کر دیکھنے لگا، جب موصوف آئے تو میں نے نہایت ادب سے وہ کتاب موصوف کی خدمت میں پیش کر دی۔ غالباً میری یہ نیازمندانہ روش موصوف کو پسند آئی۔ اور پُر لطف تبسم اور پُر محبت آنکھوں کی ایک گردش میرے حصہ میں بھی آئی۔ اب یہ یاد نہیں کہ تدریجی طور پر کیسے کیسے تعلقات بڑھتے گئے۔ مگر یہ ضرور ہوا کہ اجنبیت تام کو رہی اکثر ایسا ہوا کہ نیاز مند فراشخانہ سے جامع مسجد تک حضرت موصوف ہی کے ساتھ گیا، اور سیر و گردش میں ساتھ ساتھ رہا اور کتابوں اور نوادر کی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال میں آپ کی رائے کو سنتا اور آپ کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی کیفیات کو ملاحظہ کرتا رہا۔ اور اکثر آپ کے دولت خانے پر بھی حاضر ہونے کی عزت حاصل ہوئی اور اس یادگار زمانہ بزرگ کی بے تکلف صحبت اور بلا شرکت غیرے ہم کلامی اور لطف و کرم سے شاد کام ہونے کی عزت ملی۔ آپ کو گھر میں بے تکلف بیٹھے کھاتے پیتے اور دوسروں سے گفتگو کرتے دیکھا اور سنا آپ کے عجائب خانہ یا کتاب خانہ کی بھی سیر کی عزت حاصل کی۔ اور بعض اوقات

آپ نے کرم فرمایا اور خاکسار کے قیام گاہ پر بھی قدم رنجہ فرمایا۔

ان سب کیفیات میں ایک بات جو دیکھی گئی وہ یہ تھی کہ اگرچہ آپ کی ذات کو تکلف اور تصنع سے دور کا بھی تعلق اور واسطہ نہ تھا۔ مگر اس تمام بے تکلفی اور قدرتی انداز کے باوجود بھی حفظ مراتب کا خیال رہتا تھا۔ آپ ہر حیثیت سے ہمارے بزرگ تھے۔ اور آپ اسی انداز سے بزرگانہ حیثیت سے ہم سے سلوک فرماتے تھے۔ مگر ہم نے نہیں دیکھا کہ کسی شخص سے آپ نے خلاف وضع کسی قسم کا برتاؤ کیا ہو۔ بلکہ آپ کی نظر آداب اور وضعداری اور حفظِ مراتب کے تمام مسلمہ مراتب اور نکات پر رہتی تھی۔ آپ ہر شخص کی آدمیت اور انسانیت کا جائزہ انہی پابندیوں اور اصول پرستیوں سے لیا کرتے تھے۔ آپ گفتگو میں بے تکلف اظہار رائے میں بے تکلف اور جری اور بے لاگ تھے۔ یہ سب باتیں آپ ذیل کے واقعات میں کسی حد تک مشاہدہ کرینگے۔

اُردو زبان آپ کی زبان تھی۔ داغ نے یہ کہا تھا کہ :۔ ؎

اُردو ہے جسکا نام ہمیں جانتے ہیں داغ　　سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

داغ کو اپنی "اُردو دانی" کا یہ دعویٰ اور اُس پر یہ ناز تھا اور بے جا بھی نہ تھا مگر داغ کی زبان صرف غزل گوئی تک محدود تھی۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی اگر میر ناصر علی خان بہادر بھی یہ دعویٰ کرتے تو اُن کے مُنہ کو زیب دیتا۔ نہ صرف زیب دیتا بلکہ آپ کا یہ دعویٰ اس حقیقت سے قریب تر ہوتا۔ جس پر آپ بحیثیت اُردو زبان کے ادیب اور معجز کلام انشا پرداز ہونے کے فائز تھے۔

مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ میر صاحب "شاعر" مصطلحہ طور پر تھے یا نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ آپ کے حافظہ میں اُردو اور فارسی کے کس قدر اشعار محفوظ تھے۔ ابھی گذشتہ مئی ۳۳ء کا واقعہ ہے کہ حضرت مرحوم کے عزیز جناب سید عبدالحکیم صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی علیگ وکیل جھانسی سے ملاقات ہوئی، موصوف نے اثنائے بیان میں فرمایا کہ ان کی اہلیہ محترمہ جو حضرت مرحوم کی پوتی ہیں بیان فرماتی ہیں کہ ایک بار اسی بات کا اندازہ کرنے کے لئے "صلائے عام" کے فائل اُٹھا کر اشعار کو جانچا گیا تو اس سالہا سال کے مجموعہ میں ایک شعر بھی دو بارہ لکھا ہوا نہ ملا۔ ممکن ہے کہ اس اندازہ میں کسی قدر غلطی ہو لیکن ہم اتنا تو یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جس کثرت اور بہتات کے ساتھ ہمارے حضرت میر صاحب مرحوم نے اپنے مقالات و مضامین اشعار کا استعمال کیا ہے شاید ہماری زبان کے کسی اور ادیب اور انشا پرداز نے نہیں کیا۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کے مضامین اشعار ہی سے پیدا ہوتے اور اشعار سے تعمیر ہوتے اور اشعار ہی سے زیب و زینت پاتے اور رنگ و بو پکڑتے تھے۔

اگر علامہ شبلی نعمانی مرحوم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت میر صاحب کے متعلق یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ میر صاحب میں

قدرت ہے کہ آپ ایک ہی بات کو سو طرح سے کہہ سکتے ہیں تو غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ بھی آپ کا کمال تھا کہ ایک ہی شعر کو مختلف معانی و مفاہیم کی روشنی میں آپ پڑھ اور لکھ اور دوہرا سکتے تھے۔

آپ کا خاص اور محبوب مضمون "ہماری زبان" کی نازک خیالیاں اور شیوہ بیانیاں تھا۔ آپ ساری عمر اسی مضمون کو لکھتے رہے مگر کس انداز سے کہ ان کی زندگی میں کوئی ان کا شریک نہ تھا اور انکی وفات کے بعد ان کا جواب پیدا ہوتا نظر نہیں آتا۔

دوسرا عنوان جس پر مرحوم مزے لے لے کر لکھا کرتے تھے۔ کہنے کو "مضمون پریشاں" مگر حقیقت میں حکمت و فلسفہ کا بے پایاں اور عبرت و موعظتہ کا بیان عرفاں ہوتا تھا۔ اسی مضمون میں آپ موت و حیات کی پیچیدگی اور چیستان پر اکثر خیال ظاہر فرماتے تھے۔ لیکن مشرقی معشوق کی زلف کی طرح یہ مضمون بھی ہمیشہ محتاجِ شانہ بیان و تفسیر ہی رہا۔ لیکن جس طرح معشوق کی زلف بگڑ کر بنتی ہے اور اُلجھ کر سنورتی ہے اِسی طرح یہ مضمون میر صاحب کے اُلجھانے سے سُلجھتا تھا اور سُلجھانے سے اُلجھتا تھا بگڑ بگڑ کر بنتا تھا۔ اور محبوبوں کی پیاری پیاری اداؤں کی طرح کافران ادب اور قتیلان شیوہائے ناصری کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں سمایا کرتا تھا۔

اوروں کی کہہ نہیں سکتا مگر میں سید عبدالحکیم صاحب وکیل سے اس بارے میں متفق ہوں کہ میر صاحب گفتگو میں اکثر موت سے اپنا خوف وہراس ظاہر کیا کرتے تھے اور یہی ان کے مضامین و مقالات سے ظاہر ہوتا ہے، کہتے ہیں شیر ڈرنے والے سے چشم پوشی کرتا ہے۔ لیکن موت کے شیر کی ستم ظریفی دیکھو کہ آخر اس ڈرنے والے کو بھی اپنا شکار بنا لیا۔ گو مہلتِ زیست بھی دی مگر آخر ہم سے چھین ہی لیا لیکن موت کو اپنا گھر سجانا ہماری خواہشوں کے پورا کرنے سے زیادہ منظور تھا۔ ہمیں جس کی ضرورت تھی اُسے ہم سے لے لیا اور لے کر کیا کیا وہی جو آج تک ہر مخلوق سے کرتی چلی آتی ہے۔ تماشہ ہے قدرت بناتی ہے اور بنانے میں اپنا کمال ختم کر دیتی ہے اور موت بگاڑتی ہے۔ اور بگاڑنے ہی میں اپنے کمال کا کمال دیکھتی ہے۔

کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذی الجلال والاکرام

حیران کیوں ہوں کہ تعمیر کی تکمیل تخریب ہے اور تخریب کی تکمیل تعمیر، یہ سلسلہ خدا جانے کب سے ہے اور کب تک رہے گا کیونکہ ؏ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

اگرچہ کسی شخص کا دلّی میں پیدا ہو جانا کوئی کمال نہیں اور میر صاحب کے لئے دہلی میں پیدا ہونا کمال ہو یا نہ ہو اگرچہ آپ اس دلّی میں پیدا ہوئے تھے جو اہلِ کمال کا مورد و مسکن دلّی تھی اور آپ نے اُن بزرگوں کی آنکھیں دیکھیں اور اُن کی صحبتیں اُٹھائی تھیں جن کے وجود سے دہلی آباد بلکہ انہی کے وجود کا نام دہلی تھا، بلکہ آپ کا دہلی میں پیدا ہونا اور دہلوی کہلانا دہلی کا شرف اور دہلی کی عزت تھا، آپ دہلی کے ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو اہلِ علم کا خاندان تھا، دہلی اور اُسکی گذشتہ عظمت کو جاننے والا کون

شخص ہو سکتا ہے جو غدر سے پہلے کی دہلی کے امام المناظرہ حضرت مولانا سید ابوالمنصور کے نام نامی اور ان کے علمی کارناموں سے واقف و آگاہ نہو۔ ہمارے میر ناصر علی صاحب مرحوم اسی امام فن مناظرہ کے صاحبزادے بلند اقبال تھے۔ باپ اگر فن مناظرہ کے امام تھے تو یہ سپوت فرزند زبان و بیان اور انشار اور فصاحت و بلاغت کا امام محکم و عدل تھا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکار کسی بحرِ ادب و شعر کے شناور سے نہیں ہو سکتا۔

میر صاحب پابندِ مذہب خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ذوقِ کُتب بینی اور وسعتِ مطالعہ کے بعد میر صاحب متشدّد قسم کے دین دار نہیں رہے تھے۔ لیکن اگر دین سے مراد وسعتِ اخلاق اور چلن کی مضبوطی اور "با دوستان تلطف اور با دشمنان مدارا" ہوتی ہے تو میر صاحب سے بڑھکر شاید ہی کوئی دوسرا دیندار نکلے گا۔

نام سے تو گمان ہوتا تھا کہ شاید "شیعیت" کا کسی قدر اثر ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ مذہب کی اس تقسیم کے لحاظ سے "فاروقی" یعنی سُنّی اور پکّے قسم کے سُنّی تھے۔ ایک بار مجھ سے فرمانے لگے میاں مولوی صاحب وہ تو کہو تمہارے اسلام میں اتفاق سے ایک عمر پیدا ہو گئے تھے۔ جس نے تم کو دُنیا میں ایک قوم اور زندہ رہنے والی قوم بنا دیا۔ ورنہ سوائے مسجد میں بیٹھ کر ذکر و فکر کرنے والے عابدوں اور مرتاضیوں کے تمہارے پاس کیا ہوتا؟

اس کے علاوہ آپ کو میں نے کبھی مذہبی گفتگو کرتے۔ بحث و مباحثہ یا اِسی قسم کے مسائل سے دلچسپی لیتے نہ دیکھا نہ سُنا۔ آپ صرف شعر و ادب اور زبان ہی کے تذکروں میں خوش رہتے اور انہی باتوں کو مزے لے لے کر بیان کیا کرتے تھے۔

دہلی کی زبان دانی کا ایک بار ذکر آیا۔ فرمانے لگے دہلی لُٹ گئی اور دہلی والے مر کھپ چکے اب یہاں اُردو کہاں۔ اب جو زبان تم یہاں کے گلی کوچوں میں سُن رہے ہو یہ سوئی دھاگے والوں کی ہے۔ انہی کی دتی میں بستی ہے اور انہی کی زبان زبانوں پر ہے۔

اہلِ کمال کا ذکر آیا فرمانے لگے کہ کبھی کسی اہل کمال کی اُس کے وقت میں نہ قدر ہوئی ہے نہ ہوگی اب ہر شخص کی زبان پر غالب اور مرزا غالب ہے۔ زندگی میں غریب کو کوئی پوچھتا تک نہیں ہم نے دیکھا ہے کہ کرایہ کے ادنیٰ سے مکان میں پڑے رہتے تھے۔ بیچارے کو نہ گھر کا گھر نصیب ہوا نہ آرام سے کھانا نصیب ہوا، زندگی بھر مصیبتیں جھیلتے جھیلتے مر گئے۔ اب غالب پرستی شروع ہوتی ہے۔ فرمایئے غالب کے کس کام کی۔

زبان کے عاشقوں اور محققوں کے ذکر میں ایک مرتبہ فرمانے لگے۔ کہ نادر گردی کے زمانہ میں جب کہ دتی کی گلی کوچوں میں دتی والوں کے خون کی ندیاں بہ رہی تھیں۔ کسی طرف کو "بہارِ عجم" کے مؤلف منشی ٹیک چند بہار بھی چلے جا رہے تھے۔ غصّہ میں بھرے ہوئے ایک ایرانی نے ان پر بھی تلوار سونت کر حملہ کرنا چاہا۔ ایرانی نے

تلوار بلند کی اور منشی صاحب نے اسے روکنے کے لئے ہاتھ اُٹھایا اس لئے نہیں کہ وہ وار نہ کرے۔ بلکہ بتادے کہ فارسی زبان میں اس طرح تلوار کھینچنے کو کیا کہتے ہیں۔ بتاؤ اور بتاکر میری گردن مار دو۔

ایرانی ہندی کا یہ سوال اور ایسے نازک موقع پر کہا ہوا سوال سُنکر حیران ہو گیا۔ اس کے غصّہ کا جن اُتر گیا۔ سوال کا جواب دیا اور کہا کہ جاؤ گھر میں جاکر بیٹھو۔

میر صاحب کا قاعدہ تھا کہ جو کتاب خریدتے تھے اُسے کتاب خانہ میں رکھنے سے پہلے مطالعہ کر لیا کرتے تھے۔ اور اگر ضرورت ہوتی تھی تو اُس پر کچھ لکھ بھی دیتے تھے۔ چنانچہ وہی انگریزی ناول کی تاریخ جسکا اوپر ذکر آچکا ہے آپ نے پڑھی اور اس پر ریویو بھی "صلائے عام" کے آئندہ نمبر میں شائع کر دیا گیا تھا۔

آپ کا پرچہ "صلائے عام" آپ ہی کے مطبع میں چھپتا تھا۔ جو پُرانی وضع کا تھا۔ آپ کے مکان کے نیچے کے طبقہ میں واقع تھا اس میں سوائے اس پرچہ کے اور کچھ نہیں چھپا کرتا تھا "صلائے عام"! عام اخبارات ورسائل کے طریق پر تجارتی اصول پر شائع نہیں کیا جاتا۔ سب کام آپ ہی کرتے تھے۔ اس کا کوئی باقاعدہ دفتر نہ تھا، نہ اُس کی ضرورت تھی۔ کیونکہ پرچہ کی اشاعت کا سبب بجز اپنا شوق پورا کرنے کے اور کچھ نہ تھا۔ آپ غالباً یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ "صلائے عام" کو عام چیز سمجھا جائے۔ بلکہ آپ چاہتے تھے کہ وہ لوگ اُسے مطالعہ کیا کریں جو نازک مزاج ادیب اور بلند پایہ انشا پرداز کی طبیعت کے اور اداشناس ہوں۔ اس لئے گو شک نہیں کہ آپ کے رسالہ کا نام "صلائے عام" تھا۔ لیکن یہ "صلائے عام" عوام کے لئے نہیں تھی بلکہ یارانِ نکتہ داں کے لئے تھی۔ اور نکتہ دان لوگ دُنیا میں کم ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے صلائے عام کا دائرہ اشاعت ہمیشہ محدود اور اس بزم "صلائے عام" کے ارکان گنے چُنے لوگ ہی ہوتے تھے۔ آپ پسند نہ کرتے تھے کہ لوگ آپ کو معمولی اخبار نویس یا "رسالچی" خیال کریں اور آپ سے اس قسم کا برتاؤ کریں جیسا کہ اخباروں اور رسالوں کے مالکوں۔ منیجروں اور مہتموں سے عموماً کیا کرتے ہیں۔

مجھے یاد ہے آپ فرمایا کرتے تھے کہ خاندانی تربیت کے علاوہ منصب بلند بھی انسان کو اداشناس بناتا اور طریق خطاب اور لحن اور لہجہ کے انداز و رموز سکھا دیتا ہے۔ اسی ضمن میں فرمانے لگے کہ ایک بار "صلائے عام" کا ایک پرچہ نواب صاحب لوہارو کو نہیں پہنچا تھا۔ نواب صاحب نے رسالہ کی طلبی کے لئے جو خط لکھا اُس میں اپنے حصّہ کا رسالہ نہ پہنچنے کا ذکر تھا۔ اس کی طلبی پر اصرار یا اپنی خریداری پر زور یا نمبر خریداری کا اظہار نہ تھا۔ فرماتے تھے یہی لوگ ہیں جو "صلائے عام" کی محنتوں کی داد دے سکتے اور اُس کے نکات و لطائف سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے مجھے متعدد بار حضرت کے دولت کدہ پر حاضر ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ جب حاضر ہونا ہوتا تھا۔ جامع مسجد کی سیر میں ایک دن پہلے ہی سے وعدہ وعید اور تقرر وقت ہو جایا کرتا تھا۔ میں جاتا تا آپ منتظر ہوتے تھے، بڑے مزے کی باتیں ہوا کرتی تھیں، ایک دن حاضر ہوا، آرام کرسی پر

بیٹھے بے تکلفی سے فیرنی کھا رہے تھے۔ کھانے جا رہے تھے اور مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے جا رہے تھے۔

آپ کا کتاب خانہ یا عجائب گھر ہمیشہ بند رہتا تھا۔ حتیٰ کہ جب آپ وہاں بیٹھے ہوں تب بھی کم از کم میں نے ہمیشہ اسی طرح دیکھا ہے جب اندر جانا ہوتا تو اندر جاتے اور پھر اُسے بند کر دیتے اور بیٹھ جاتے۔

آپ نے ایک دو بار اپنے عجائبات و نوادر کی مجھے بھی سیر کرائی تھی۔ لیکن بڑے اہتمام اور احتیاط کے ساتھ کواڑ کھولے۔ مجھے ساتھ لیا اور ہر چیز آپ دکھاتے اس کی تاریخی اور فنی خصوصیتیں بیان کرتے رہے۔ عجائب خانہ دیکھکر ہمیں تسلیم کرنا پڑا کہ ہمارا ممدوح الفاظ و معانی کا ہی بادشاہ نہ تھا بلکہ نوادر و عجائب کے جمع کرنے اور ان کو پرکھنے کے لحاظ سے بھی اپنے عصر کا یگانہ اور فرزانہ بزرگوار تھا۔

جس احتیاط سے ہمیں سیر کرائی گئی اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ آپ کو اپنا ذخیرہ بہت عزیز تھا اور آپ کو اپنے مہمانوں سے باوجود محبت کے ان پر غیر معمولی اعتماد نہ ہوتا تھا۔ سالہا سال کی بات ہی اس عجائب گھر کی تفصیل بیان کرنا تو مشکل ہے۔ لیکن اتنا بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ صناعی اور دستکاری کے بے مثال نمونوں اور خطاطی و مصوری کے شاہکاروں سے آپ کا عجائب خانہ پری خانہ بنا ہوا تھا۔ نہ ہر شخص وہاں جا سکتا تھا۔ نہ تنہا جا سکتا تھا۔ وہاں جانے کے لئے نہ صرف آپ کی اجازت ہی ضروری ہوتی تھی بلکہ آپ کی معیت بھی ازبس لازمی ہوا کرتی تھی۔

میر صاحب قبلہ مرحوم کی جو لفظی تصویریں اوپر پیش کر چکا ہوں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس شکل و شمائل کا انسان ظاہر داریوں اور تکلف و تصنع کی دُنیا سے کس قدر ماورٰی ہونا چاہیئے" اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اس کا دل دریا کا سا وسیع ہونا ہی چاہیئے تھا۔ چنانچہ بعض حالات ہمارے علم میں آئے ہیں وہ گواہ ہیں کہ موصوف دل کے غنی اور ہاتھ کے سخی تھے۔ جھانسی کے سفر میں جناب سید عبدالحکیم صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ حکومت نے آپ کے حُسنِ خدمات کے صلہ میں مزرعہ اراضی کے کچھ مربع جات بھی عطا کئے تھے۔ کون ہے جو آتی ہوئی نعمت کو مسترد کر دے۔ میر صاحب نے لے لئے، لیکن کوئی شخص تاک میں تھا۔ شاید عالی ہمت سید کی عالی حوصلگی اور دریا دلی سے آگاہ تھا مسترحمانہ صورت بنا کر حاضر ہوا اور بولا کچھ نذرانہ لیجئے اور یہ مربع مجھے عنایت کیجئے۔ آپ اس خرخشہ میں کیا پڑینگے۔ سید صاحب نے معمولی نذرانہ جو اصل قیمت کا بہت ہی حقیر قسم کا حصّہ کہا جا سکتا ہے قبول کر لینا چاہا۔ اور اپنے حقوق مالکانہ اُس شخص کی طرف منتقل کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن خویش و اقارب نے منظور نہ کیا۔

جوانی میں شاید خط اچھا رہا ہوگا۔ لیکن میں نے جس وقت آپ کا خط دیکھا ہے بس اس قابل تھا کہ پڑھ لیا جائے، غالباً سن و سال کا اثر ہاتھ پر پڑا اور ہاتھ کی کمزوری خط کی خامی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ جامنی رنگ کی روشنائی سے لکھتے تھے۔ خاکسار کے نام جو چند مکاتیب ارقام فرمائے تھے وہ اسی روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں، مکان پر بھی اسی روشنائی سے لکھتے دیکھا ہے۔ لکھنے کا انداز بے تکلف تہا آرام کرسی پر

بیٹھکر بے تکلف کاغذ ہاتھ میں لے کر موٹے سے قلم سے ٹیڑھی بیڑھی سطریں کاغذ پر بناتے جاتے تھے۔ لکھتے وقت چہرہ پر پیارا پیارا ہلکا ہلکا تبسم دریا کی ہلکی لہروں کی طرح پھیلا رہتا تھا۔

بوڑھاپے میں بھی باتیں جوانی کی لکھتے تھے۔ اور وہ بھی جوان لب و لہجہ میں۔ دُنیا کی ہر حسین چیز کو عموماً اور خصوصاً ہماری زبان کو جوان رعنا معشوقہ سے تشبیہ دیتے تھے۔ اور اس کی خرابی اور فنا کو جوانامرگی یا پیری میں ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔

عام طور پر لوگ بُوڑھوں کو جوانی اور جوانوں کی سی باتیں کرتے دیکھکر چیں بجبیں ہوا کرتے ہیں مگر ہمارے میر صاحب قبلہ کا اندازِ نگارش ایسا تھا کہ وہی باتیں جو دوسروں کی زبان سے اجنبی معلوم ہوتیں آپ کی زبان سے محبوب اور دلکش معلوم ہوا کرتی تھیں۔ یہ ان کا کمال تھا کہ معمولی اور عوام کی اصطلاحات کو بھی اس ماہرانہ اور اُستادانہ شان سے استعمال کرتے اور اپنے مضامین میں کھپایا کرتے تھے کہ ان کی عمومیت کی گرانی دُور ہو کر حُسن و رعنائی کی خصوصیت پیدا ہو جایا کرتی تھی۔

آپ جانتے ہیں کہ مُرغ بازوں میں "نوک پلک" کب دیکھی جاتی ہیں جنہوں نے اصیل مرغوں کی لڑائی دیکھی اور ہر "پانی" کے بعد "پہاوتوں" کو مرغوں کی نوک پلک دیکھتے دیکھا ہے وہ نوک پلک دیکھنے کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے میر صاحب نے یہی ترکیب مضامین کی دیکھ بھال اور نظر ثانی کے معنوں میں استعمال کی ہے۔ چنانچہ "صلائے عام" میں آپ نے ایک بار لکھا کہ ہر صبح کو اُٹھکر آپ پہلے اپنے شب گذشتہ کے لکھے ہوئے مضامین کی نوک پلک دیکھتے ہیں۔

جوانی کی کون کہہ سکتا ہے لیکن ہم نے میر صاحب کے تمام مضامین جو "صلائے عام" وغیرہ میں ہماری نظر سے گذرے اور نجی ملاقاتوں میں۔ ہمیشہ ایک ہی معشوق کی تعریف و توصیف سے تر زبان پایا ہے۔ آپ کی معشوقہ کوئی گوشت و پوست کا مضغہ اور لوتھڑا نہ تھا۔ بلکہ آپ کی معشوقہ ہماری زبان تھی۔ آپ اسی کی شان میں "قصیدہ" کہتے تھے۔ اسی کا مرثیہ لکھتے تھے۔ اور آپ کی غزل سرائی بھی زبان ہی کے ذوق و شوق اور ولولہ کی آئینہ دار ہوا کرتی تھی۔

آپ چاہتے تھے کہ آپ کے تمام مضامین مرتب و منظم ہو کر کتابی صورت میں آجائیں۔ ایک دفعہ میں نے آپ سے ذکر کیا تو آپنے اس تجویز کو بہت پسند فرمایا۔ پھر میں نے اسی مطلب سے "صلائے عام" میں ایک مضمون لکھا۔ حضرت میر صاحب قبلہ نے مجھے ایک خط کے ذریعہ مطلع فرمایا کہ میرے مضمون کا وہ حصّہ جو آپ کے مضامین کی جمع و تدوین پر مشتمل تھا۔ خصوصیت سے بہت پسند کیا گیا تھا۔ آپ کے مضامین کی جمع و ترتیب کی ذمہ داری جیسا کہ خود حضرت مرحوم نے مجھے بیان فرمایا تھا۔ مولانا نیاز فتحپوری مدیر شہیر مجلۂ نگار نے لی تھی، آپ کا منشاء تھا کہ میں بھی اس بارے میں جو خدمت ممکن ہے اس سے دریغ نہ کروں میں نے خوشی سے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ لیکن میری قسمت نے مجھے دہلی سے نکالکر دیس بدیس پھرایا۔ افسوس کہ

وہ نیک ارادے بروئے کار نہ آسکے۔ مجھے نہیں معلوم مولانا نیاز نے اس بارے میں کس قدر کام کیا ہے۔ قیاس یہ ہے کہ غالباً کچھ نہیں ہوا۔ کیونکہ میں نے جب گذشتہ مئی ۳۳ء حضرت مرحوم کے ہونہار پوتے جناب سید انصار ناصری بی اے سے اس امر کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ابھی تک کچھ نہیں ہوا اور سب کچھ باقی ہے۔ اُنکے جواب سے کم ازکم یہ یقین ضرور ہو گیا کہ اُن کے ہاتھوں یہ نیک فرض بحُسن وخوبی انجام پاسکیگا۔

میر صاحب مرحوم ان لوگوں میں تھے جو زبانِ حال سے یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ ؎

یاد گارِ زمانہ ہیں ہم لوگ   یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

ایسے باکمال ہر روز پیدا نہیں ہوتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی تاریخ آپ بناتے ہیں اور ان کی زندگی ان کے کارناموں پر مبنی ہوتی ہے۔ اُردو زبان کے جس قدر سکول ہیں ان میں سے ایک سکول کے بانی اور شاید خاتم بھی میر صاحب قرار پائینگے۔ اپنی طرزِ خاص میں میر صاحب کسی کے مُقلد نہ تھے۔ کسی کے محتاج نہ تھے۔ مجھے یقین ہے، کہ آپ کا طرزِ نگارش ایسا سہل ممتنع تھا کہ آپ کے مداحوں میں بھی کوئی شخص کامیابی سے آپ کے طرز کا چربہ بھی نہیں اُتار سکتا۔ مان لیجئے کہ آپ نئی بات نہ کہتے تھے۔ تسلیم کر لیجئے کہ آپ کے ہاں ایجاد واختراع نہ تھی یہ بھی قبول کہ آپ فلسفہ وحکمت کے خزانہ نہ لٹاتے تھے۔ مگر اس سے انکار کی کون جرأت کریگا کہ آپ ہر ایجاد کو سنوارتے تھے۔ عروسِ سخن کو سنگھارتے تھے۔ اور ہر بات کو ایسے ایسے شیوہ ہائے دلبرانہ اور دلربایانہ سے دُہراتے تھے کہ ہر بار بڑھکر مرحبا اور صلی علیٰ کا نعرہ اہلِ دل اور اہلِ نظر کی زبان سے بلند ہوتا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ انسان کی حالت یہ ہے کہ "فبأی آلائی ربکما تکذبان" اگر کلام باری میں بار بار آجائے تو کوتاہ نظری سے اسپر بھی اعتراض کر بیٹھتا ہے۔ لیکن ہمارے سید صاحب کو وہ طریقِ خطاب اور اسلوب بیان دیا گیا تھا۔ کہ نادانوں کی تو بات ہی کیا ہے کوئی اہلِ نظر اور با مذاق آپ کے تکرارِ کلام پر حرف گیری نہ کر سکتا تھا۔

ہمیں یقین ہے کہ مدتوں میر صاحب کا طرزِ انشاء بے مثل رہیگا۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کی تقلید کرنے والوں کے لئے آپ کی روش سے اُڑنا آسان کام نہ ہوگا۔ یہ بھی ضرور ہے کہ آپ کی شراب ادب کہنہ ہوکر نشہ آوری میں ترقی کرتی چلی جائے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ جوں جوں بُعدِ زمانی آپ کے نغمہ کو دور سے دور تر لیتا جائے گا اس کی کیفیت اور نشہ آوری میں اضافہ ہوتا جائے گا، ہمیں اس کا بھی یقین ہے کہ زمانہ آئیگا کہ میر تقی کی غزل کی طرح میر ناصر علی کی نثر کی بھی پرستش ہوگی۔

کون ہے جو مرحوم کے ہر قسم کے مضامین۔ مقالات۔ مکاتیب اور حالات کو جمع و مُرتب کرنے کی خدمت اپنے ذمہ لے اور ان نوادرِ ادب اور جواہر پارہائے انشاء کو مُرتب کرکے فنا کے جھونکوں اور انقلاب زماں کے تھپیڑوں سے محفوظ ومصئون کرے؟ اس مبارک فرض کو بحُسن وکمال انجام دینے کیلئے ہماری نگاہیں اُن کے لائق پوتے سید انصار ناصری کی طرف اُٹھتی ہیں، اور آپ کی کامیابی کیلئے خلوصِ دل سے دُعا کرتے ہیں۔

میر ناصر علی خاں

سرائیست گیتی پئے رہ نورداں | سفر لاجرم چوں رسد شب بہ پایاں

خوشا رہروے کو بہ منزل رسیدہ | فروہشت رختِ سفر شاد و فرحاں

بیارم مثالے بہ تصدیق بالا | بیاد آورم میر ناصر علی خاں

عطا کردہ جاں آفرینش ز رحمت | فراغ از معاش و معیشت ز دوراں

بہ صورت بہ سیرت چو قدسی نہادے | با خلاقِ حسنہ یک از صد ہزاراں

بمیدانِ علم و ادب یکّہ تازے | بہ ارکانِ دولت ز مقبولِ سلطاں

فصاحت کنیزش، بلاغت غلامے | ز توصیفِ بالا خیالِ پریشاں

چو ساقی ز میخانہ عامش صلائے | چو صوفی ز ممبر پیامے بہ خاصاں

بہ بزمِ سخن مسند آرائے عزّت | بہ حسنِ بیاں بردہ گوئے ز سحباں

چو بادِ صبا از چمن زارِ عالم | گذر کرد چوں بوئے گل از گلستاں

پئے سالِ رحلت سروشے بہ ساحر | پیامے رسانید از سوئے رضواں

سفر کرد ہر گاہ از دارِ فانی

بہ فردوس شُد میر ناصر علی خاں

۱۳۵۲ہجری

[illegible]

خان بہادر میر ناصر علی مرحوم

(از جناب محمد سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور)

عربوں نے جس طرح نظم میں کمال دکھایا نثر میں اس سے کہیں زیادہ کمال کے مدعی بنے کہ ساری دنیا کو عجم یعنی گونگا کہنے لگے یعنی یہ کہ ہم ہی بات کرنا جانتے ہیں باقی دنیا ہماری زبان آوری اور زبان دانی کے مقابلہ میں گونگی ہے۔ یہ دعویٰ ایسا سچا نکلا کہ قرآن نے اس کی تصدیق کی کہ خدا ہی ان کی نثر کا جواب دے سکتا ہے۔ اہلِ ایران نے پہلے تو دیباچوں پر زور لگایا پھر بڑے بڑے ادیب و نثار پیدا ہوئے۔

اُردو نے شعراء تو بڑے بڑے پیدا کئے۔ مگر نثر لکھنے والے اور دعوے کے نثر لکھنے والے سرمہ لگانے کو ملجائیں تو بہت ہیں۔ نثر میں کمال پیدا کرنے کی اُردو والوں نے کوشش ہی نہیں کی اور اگر کی تو جس طرح زبان کا حق تھا نہیں کی۔

میر صاحب ناصر علی خاں مرحوم کی اُردو کا ابھی تک تو کوئی جواب نہیں ملتا ایک دیباچے ہی کے نام سے جتنا اُنھوں نے لکھا اس کا جواب مشکل ہے "مضمون پریشاں" کو دیکھئے ادب اور زبان کیلئے تازگی کی باتیں ہیں۔ نثر میں ساقی نامے جس بہتات سے اُنھوں نے لکھے کسی کو نثر میں ساقی ناموں کا تخیل بھی نہیں ہوا۔

ہندوستان میں بڑے بڑے نثر لکھنے والے پیدا ہوئے اور ان کے مقلد بھی پیدا ہوئے میر صاحب کا اب تک تو کوئی جواب نظر نہیں آتا۔ میر صاحب مرحوم سے جب جب نیاز حاصل ہوا کبھی آدھ گھنٹہ کبھی گھنٹہ بھر کبھی دو گھنٹے۔ معلوم ہوتا ہے صلائے عام سن رہا ہوں۔ میر صاحب کے کمال میں یہ بھی ایک بات تھی کہ جس طرح بولتے تھے وہی تحریر بھی تھی۔ تحریر چھوڑیئے باتیں سُنیئے باتیں چھوڑیئے صلائے عام پڑھیئے کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

میر صاحب سے ایک مرتبہ مذہبی گفتگو کا مجھے اتفاق ہوا میر صاحب مرحوم فرمانے لگے کہ انگریزی زبان میں کوئی کتاب مذہب پر ایسی نہیں ہے جو میرے علم میں آئی ہو اور میں نے نہ دیکھی ہو۔ اُن سے کسی موضوع پر بات کرنا کارے دارد تھا۔ عجب پُر مغز و پُر از معلومات گنی چُنی باتیں کرتے تھے۔ اُردو کے لئے تو اُنکے مساعی زندہ جاوید رہینگے۔ اِس کے لئے ان کی زندگی کے تمام تحریروں کو یکجا کر کے اگر ایک یا کئی جلدوں میں جمع کر دیا جائے تو اُن کی زندگی کی یادگار اور ان کے کارناموں کو کافی ہے۔ کوئی اور ملک ہوتا تو معلوم نہیں اُن کی یادگار میں کتنے رسالے اور اخبار جاری ہو جاتے جو تمام عمر ہاتھوں ہاتھ بکتے۔ ان کی یادگار معلوم نہیں کس کس طرح دنیا قائم رکھتی، مگر یہ ہندوستان ہے یہاں قابلِ یاد ہستیاں فراموش کی جاتی ہیں اور ظالموں کے مجسمے قائم ہوتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اگر کوئی پرچہ اُن کی یادگار میں قائم ہوا اور مجھے موقع ملا تو میں اُن کی بابت بہت کچھ لکھوں گا۔ انشاءاللہ اس وقت سرسری طور پر یہ چند بیکار لفظ حاضر ہیں۔

محمد سبحان اللہ

ماتمِ علم و فضل

(از حضرت خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی)

جناب انصار ناصری صاحب

تسلیم۔ آپ کے تمام خطوط مجھے ملے، میں چاہتا تھا کہ اطمینان سے کچھ رسالے "صلائے عام" کے دیکھکر مہینہ دو مہینہ میں ایک مضمون لکھوں اسی کے ساتھ آپ کو تعزیت نامہ بھی بھیجدوں مگر آپنے تو ناطقہ بند کردیا۔ اچھا خدا آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے "خان بہادر مرحوم کے حالات کا نمبر جو آپ نکالنا چاہتے ہیں اُسکے لئے تو بہتر سے بہتر مضمون موجود ہوں گے لیکن مجھ ضعیف و نحیف نے ناسازیِ طبیعت کی حالت میں صرف آپ کے ارشاد عالی کی تعمیل کی ہے اسے مضمون بھی نہیں کہہ سکتے ہیں کیونکہ مرحوم کے حالات مجھے معلوم نہ تھے نہ "صلائے عام" کے دیکھنے کا موقعہ ملا صرف آپکا حکم بجالایا۔

عشرت

سفرِ مُلکِ عدم درپیش ہے اور ہم آپ سب مسافر ہیں دن رات چلے جاتے ہیں اور مُلکِ عدم سے قریب ہوتے جاتے ہیں، لیکن غفلت کا یہ زور ہے کہ ہم کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ کہاں جاتے ہیں اور کتنے دنوں کا سفر ہے۔ ایک دن تو وہ تھا جب ہم منزلِ عدم سے عالمِ وجود میں آئے اور آتے ہی رونے لگے کہ ہائے کس بلا میں پھنس گئے، دوسری منزل ۱۳ برس کی تھی جسے بچپنا کہتے ہیں جس میں ہمیں خود اپنی خبر نہ تھی کہ کہاں سے آئے اور کہاں جاتے ہیں دوسرے لوگ ہماری پرورش اور نگہداشت کرتے تھے، ابھی آدھی منزل ختم ہونے پائی تھی کہ مدرسے میں بھیجدیے گئے اور دُنیا کے کاروبار کی تکمیل کے لئے تحصیلِ علم کرنے لگے اسی کے ساتھ ساتھ کچھ مذہب کی باتیں بھی سیکھیں اور وہ بھی بطور تفننِ طبع، اب تیسری منزل میں قدم رکھا جس کا فاصلہ ۲۷ برس کا تھا اور جس کی منزل زایدسے زاید چالیس برس کے سن میں طے ہوتی تھی اس میں بڑی شورشیں بڑی خرابیاں بڑی بڑی ذمہ داریاں تھیں لیکن ہمیں ایک شراب کی بوتل کا نشہ تھا حالانکہ کام بہت تھے، اور وقفہ کم تھا۔ تحصیلِ علم سے فراغت کرنا دوسروں کی مدد کرنا اپنی آمدنی کی فکر بیاہ شادی کی ذمہ داری باپ بننے کی کوشش کچھ ایسے پیچ در پیچ واقعے تھے جن سے ہم کو سانس لینے کی فرصت نہ ملی کیونکہ ہمارے مربیوں نے ہمکو سنِ تمیز تک پہنچا کر اپنی چوکیداری سے ہاتھ اُٹھالیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ یہ زمانہ پلک

جھپکانے میں ختم ہوگیا اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی، اب آنکھ کھُلی تو اپنے قویٰ کو مضمحل دماغی طاقت کو کمزور پایا اسپر اولاد کے مصائب کا بارِ گراں اور جو اولاد نہ ہوئی تو اپنی نگہداشت خود بلائے جان ہوگئی آج سر میں درد کل کمر میں چک آگئی، کسی کروٹ چین نہیں ملتا کسی گھر بھی آرام نہیں، بڑے بڑے موذی امراض اپنا پیش خیمہ ڈالے پڑے ہیں، طبیعت ایک حالت پر نہیں رہتی، قوتِ ہاضمہ ضعیف ہوگئی، بصارت، سماعت نے جواب دیدیا، حواسِ خمسہ میں فرق آگیا، دانتوں نے چالیس برس کے بعد جدائی اختیار کی، یہ منزل انتہا سے انتہا چالیس پنتالیس برس میں ختم ہوگئی اور آنکھ بند ہوگئی، اب آخری وقت میں آنکھ کھُلی تو معلوم ہوا کہ دُنیا میں ہم جس واسطے آتے تھے اسے ناتمام چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، کاش دس بیس برس اور زندہ رہتے تو کچھ آخرت کا زادِ سفر ہمراہ لے لیتے مگر موت مہلت نہیں دیتی۔ اور دل کی ہوس دل میں رہ گئی۔ یہ حال تو ان لوگوں کا ہے جو خدا کے فضل سے عمرِ طبعی تک پہنچ جاتے ہیں، ان کا حال نہ پوچھیئے جو اپنی منزلیں دو چار روز میں دو چار دس بیس تیس چالیس پچاس برس میں طے کر کے گوشۂ قبر میں آرام کرتے ہیں۔

میرے خیال میں اگر لوگوں کو مثل حضرت نوح علیہ السلام نوسو برس کی زندگی عطا کی جائے تو بھی دُنیا کی دلچسپیوں کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہے، دُنیا کے مصائب میں بھی ایک لذت ہے، خان بہادر سید ناصر علی مرحوم مغفور کے لئے ہمارا رونا اور بے قراری اس لئے نہیں ہے کہ انہوں نے عمر کم پائی بلکہ اس غرض سے ہے کہ جو فائدہ ان سے ہندوستانی زبان کو پہنچ رہا تھا اس کا دروازہ بند ہوگیا۔ دہلی آج بیوہ ہوگئی، اسکے کمالات مٹ گئے جس کی ذات پر اُس کو ناز تھا وہی نہ رہا۔ ایک جوان ایڈیٹر صاحب کے متعلق سُنا ہے کہ وہ کہا کرتے ہیں جب یہ دو چار بڈھے مرجائینگے اس وقت ہماری زبان کی دُنیا میں قدر ہوگی، اب تو یہی صورت نظر آتی ہے، چراغ لے کر تمام ہندوستان کو چھان ڈالئے تو بھی میر ناصر علی کی ٹکر کا ایک بھی منشی آپ کو نہ ملے گا، یہ چودھویں صدی میں ہندوستان کے لئے صائب پیدا ہوئے تھے، جو کچھ دعویٰ کرتے تھے اس کی مثال کا ایک پہلو ضرور نکال لیتے تھے، لسان الملک منشی سید ریاض احمد ان کی نثر کے پُرانے دلدادہ ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اُن کا ثانی تمام ہندوستان میں نہیں ہے، خان بہادر تو اُردو کے بادشاہ تھے۔

رسالہ "صلائے عام" کے پُرانے پرچے اُٹھا کر دیکھئے، برسوں دیباچہ پر نئے انداز سے طبع آزمائی کی ہے اور ہر دفعہ ایک سے ایک بہتر لکھا، "مضمونِ پریشاں" آخر عمر میں شروع کیا تھا اور اپنے بعض احباب کو دعوت دی تھی کہ اسپر کچھ لکھیں مگر کوئی بھی قلم نہ اُٹھا سکا۔ سیدھی سیدھی باتوں میں نزاکت پیدا کرنا انکا حصّہ تھا۔

ایک دفعہ میں نے اودھ کی تاریخ پر ایک مضمون لکھا، اُسے آپ نے بیحد تعریف کر کے چھاپا اور مجھے لکھا کہ تاریخ لکھتے ہیں تو تمکو ملکۂ راسخہ ہے مجھے رشک آتا ہے کہ تم اودھ کی تاریخ پر جو مضامین لکھتے ہو، کاش اُس کے بدلے شاہانِ دہلی کے حالات لکھو۔

میں نے عرض کیا کہ دہلی کے حالات میں تو تاریخ کی بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں، ان کے علاوہ مزید حالات کا

ملنا دشوار ہے، اودھ کی تاریخ نامکمل ہے اور اُس کے حالات جد ید بھی کچھ پُرانے لوگوں سے ملجاتے ہیں، اس لئے اُنہیں تازگی پیدا ہوجاتی ہے، آپ نے لکھا مجھے تو دہلی سے محبت ہے تم جو کچھ لکھو گے اُسمیں تازگی پیدا ہوجائے گی۔

اس زمانے میں دہلی ایک بزرگ خاندان وزارت کے درانتاج سید مبارک علی سہیل فارسی گو شاعر لکھنؤ میں رہتے تھے اور میرے پاس اکثر تشریف لایا کرتے تھے، اُن کو نظام حیدرآباد سے پنشن بھی تیس روپیہ ماہوار ملتی تھی، ہر مہینے اپنا حیات نامہ مجھ سے دستخط کرکے بھیجتے تھے۔

میں نے اُن سے عرض کیا کچھ دہلی کے پُرانے حالات جو آپ نے سُنے ہوں بیان کیجئے دہلی کا نام سُن کے وہ روتے لگے اور کہنے لگے تم نے ایسا تیر مارا جس کا اندمال مشکل ہے کاش اور باتیں کرتے اور دہلی کا نام نہ لیتے، پھر کچھ اپنے بچپنے کی باتیں یاد کرکے بیان کیں، اُس میں یہ بھی بیان کیا کہ مومن دہلوی کا مکان ہماری خالہ کے مکان سے متصل تھا، روز وہاں جاتے تھے تو دیکھتے کہ حکیم مومن خاں اس گلی میں ٹہلتے تھے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں متحرک ہیں اور گنگنا کر کچھ شعر کہا کرتے تھے، گورے تھے زلفیں رکھتے تھے، خوبصورت تھے، منجملہ اس کے اور بھی چشم دید واقعات بیان کئے۔ میں نے ان سب باتوں کا ایک مضمون بنا کر میر صاحب قبلہ کی خدمت میں بھیج دیا، آپ نے مضمون بہت شوق سے چھاپا اور پانچ روپے کا نوٹ رسالہ کے ساتھ مجھے بھیج دیا۔ میں نے لکھا قبلہ اس کی کیا ضرورت تھی مضمون تو اس قابل نہ تھا کہ وہ چھاپا جاتا۔

اس کے علاوہ میں آپ جیسے بزرگ سے صلۂ خدمت لینا پسند نہیں کرتا، اجازت دیجئے کہ واپس کردوں، کہنے لگے یہ مضمون کا صلہ نہیں ہے تمہاری تلاش کی داد ہے، تم نے تاریخ میں دوچار واقعات اضافہ کردئے کچھ مجھی پر موقوف نہ تھا، وہ چاہتے تھے بہتر سے بہتر نثار اور ناظم "صلائے عام" میں جمع ہوجائیں اکثر لکھا کرتے تھے منشی سید ریاض احمد کی جدید غزلیں بھیجدو، مجھے اُن کا کلام بہت پسند ہے۔

ایک دفعہ میری نسبت کچھ الفاظ خط میں لکھے، میں نے لکھا میر صاحب میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے مضمون لکھنا نہیں آتا، آپ تعریف نہ کیا کیجئے بلکہ عیوب بتا دیا کیجئے تو مجھے فائدہ پہنچے گا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ کے رنگ کی تقلید کروں مگر وہ کسی طرح نہیں آتا۔

اب تو یہ ماتم ہے، کہ زمانہ کے زبردست ہاتھ نے ہم سے ایک ایسا صحیح مذاق والا نثر نویس اُستاد چھین لیا جس کا مثل ایک صدی تک ملنا محال ہے، خدا اس کے سوگواروں کو صبر عنایت کرے اور ہم لوگوں کو اُنکی پیروی کی توفیق دے۔ التماس دعا۔

ولیٔ اُردو

اُردو کے حق شناسو، اُردو کے جاں نثارو
کروٹ ذرا تو بدلو، خوابِ گراں سے چونکو

تم بے خبر ہو کیسے بے ہوش سو رہے ہو
سرمایہ زندگی کا دن رات کھو رہے ہو

شادی و غم کا تم پر کوئی اثر نہیں ہے
سود و زیاں کی تم کو کوئی خبر نہیں ہے

دُنیا تمہاری برہم ہے اور ہو رہی ہے
طاقت تمہاری اب کم ہے اور ہو رہی ہے

پاؤں کی فکر ہے اب تم کو نہ ہوش سر کا
کیا حال ہے تمہارے اجزائے منتشر کا

عزّت کا اپنی تم کو اب پاس ہی نہیں ہے
فتح و شکست کا کچھ احساس ہی نہیں ہے

غفلت کی نیند کب تک سوتے رہو گے آخر
دیکھو وہ جا رہے ہیں محفل سے میرِ ناصر

وہ حق شناسِ منزل منزل سے جا رہا ہے
مسند نشینِ محفل محفل سے جا رہا ہے

ناقابلِ تلافی بے شک ہے آج یہ غم
خدمت گذارِ اُردو ناصر علی کا ماتم

وہ خادمِ زباں تھا۔ مخدومِ انجمن تھا
اُردو تھی اُس پہ نازاں وہ نازشِ وطن تھا

وہ نازِ میر و غالب، وہ جاں نثارِ اُردو
قائم تھی جس کے دم سے اب تک بہارِ اُردو

وہ جا رہا ہے دیکھو خاموش انجمن سے
اُردو سے واسطہ ہے اس کو نہ اب وطن سے

دُنیائے علم و فن میں تھا ایک مردِ واحد
وہ "تیرہویں صدی" کا حق آشنا مجاہد

"پیغامِ سیدی" کا بطلان کرنے والا
تفسیرِ مذہبی کا اعلان کرنے والا

اخبار "ناصری" میں ہلکی سی اِک ظرافت
دُنیا کو دے رہی تھی پیغامِ لطف و راحت

شاعر نہیں تھا لیکن شاعر نواز تھا وہ
نغمہ نہیں تھا لیکن نغموں کا ساز تھا وہ

اُسکی "صلا" میں گویا رنگینیٔ بیاں تھی
نُدرت تھی زندگی تھی مفہوم تھا زباں تھی

ناصر علی یقیناً۔ اُردو کی انجمن میں
بے مثل بے بہا تھا۔ یکتا تھا علم و فن میں

حسیب سعدی

قطعۂ تاریخ وفات خان بہادر میر ناصر علی "مدیر صلائے عام" دہلی اعلی اللہ مقامہ

(از جناب احسن مارہروی صاحب لکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

میر ناصر علی نے کی رحلت — مرغِ جاں نے کیا بدن خالی

ہے بغیر اس کے شہر یوں سونا — جیسے بلبل سے ہو چمن خالی

کیوں نہ ہو گنگ نطق و گویائی — بے زباں رہ گیا دہن خالی

کیوں نہ تیرہ جہانِ اردو ہو — ہو گیا شمع سے لگن خالی

کیوں نہ دہلی ہو غمکدہ کہ ہوا — ایک پُرمایہ سے وطن خالی

شہر کیا دہر کیا زمانہ کیا — سب ہیں بے اشہرِ زمن خالی

اس کے ماتم میں چاک ہونے سے — نہ بچا کوئی پیرہن خالی

نظر آتی ہے بزمِ اردو میں — مسندِ صدر انجمن خالی

بالیقیں تھا وہ خاتم الادبا — نہ سمجھئے یہ حسنِ ظن خالی

کیف و مستی و جوش سے اس کا — نہ ملا ایک بھی سخن خالی

اس کی ہر بات میں تھی جدت بھی — تھا نہ وہ تابعِ کہن خالی

سیدھی سادی نگارشوں کو بھی — چھوڑتا تھا نہ بانکپن خالی

عملاً بھی تھا عاملِ کامل — تھا نہ علامِ علم و فن خالی

اس کی دھن، خدمت ادب تھی فقط — اور اردو کی تھی لگن خالی

اس کے غم میں ہے آنکھ بھی گریاں — دل ہی اک کیا ہے پُرمحن خالی

روح فرسا بھی جاں گسل بھی ہے — نہیں یہ صدمہ دل شکن خالی

اثرِ انقلابِ دوراں سے — کوئی گھر ہے نہ کوئی بن خالی

کیا مروت شعار ہو دنیا ہے وفا سے یہ پیرزن خالی

دستبرد اجل سے لاکھوں گھر ہیں تہہ گنبد کہن خالی

کوئی جاتا نہیں کسی کے ساتھ دفن ہوتا ہے ایک تن خالی

ہے جسد قبر میں تن تنہا زیب آغوش ہے کفن خالی

اُس کی رحلت کا سُنکے حال احسن دل ہوا میرا نوحہ زن خالی

میں نے لیکن کہیں وہ تاریخیں جن سے حاصل نہیں ہیں سن خالی

بلکہ ہجری و عیسوی دونوں ہیں غلو سے حقیقتہً خالی

ناصر میر لشکر اردو
کر گیا گوشۂ سخن خالی
۳۴ ۶ ۱۹

آہ! میر ناصر علی مرحوم

از جناب سیّد وزیر حسن دہلوی

دلّی سے چند میل دور ایک مقام اوکھلا ہے۔ جہاں دریائے جمنا کا پُر فضا بند ہے۔ یہیں خان بہادر میر ناصر علی مرحوم دہلوی سے میری پہلے پہل مُلاقات ہوئی۔ برسات کا موسم تھا۔ کالی کالی گھٹائیں رومجھوم آ رہی تھیں جن میں کہیں بگلوں کی قطاریں دکھائی دیتیں۔ جیسے کسی حور کے کالے لانبے لانبے بالوں میں موتیا کے پھول سجے ہوں۔ تو کبھی بجلی چمک جاتی۔ جیسے بھاپ کے لطیف دریا میں نور کی مچھلی تڑپ اُٹھے۔ جمنا بھی خیال کی طرح وسیع اور جذبات کی طرح بے تحاشہ بہہ رہی تھی۔ ایسے وقت دلّی والے بھلا کب چوکتے ہیں۔ انہیں تو خاص طور پر گل و گلزار کی سوجھتی ہے۔ جوانوں کا تو خیر پوچھنا ہی کیا۔ بچے بوڑھے تک گلگشت کو نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ میں بھی ہم جماعتوں کے ساتھ اوکھلے پہنچا۔ یہاں کیا دیکھتا ہوں کہ سیلانیوں کی ایک برات اُتری ہوئی۔ کوئی "ہوا دار" (بنگلہ) ہی میں سے ہوا خوری کر رہا ہے۔ سامنے جمنا اٹکھیلیاں کر رہی ہے۔ کوئی مچھلی کا شکار کھیل رہا ہے۔ کچھ بیٹھے آم کھا رہے ہیں۔ اور ایک دوسرے پر چھلکے پھینکے جا رہی ہیں۔ کچھ ہارمونیم طبلہ سنبھالے موج کر رہے ہیں۔ دو چار نے جھولا بھی ڈال لیا ہے۔ جس پر دو کی جگہ چار پانچ لد گئے ہیں۔ غرض چوطرف ہنسی دل لگی ہو رہی ہے اور ایک دھوم مچی ہوئی ہے۔ ہم نے بھی ایک طرف چھاؤنی چھائی۔ اور ابھی پوری طرح دم بھی نہ لیا تھا کہ دیکھا ایک فٹن سے چار نورانی صورتیں اُتریں۔ اور ہماری جانب رُخ کیا۔ تل چانولی ڈاڑھیاں۔ کسی کے پٹھے۔ کسی کے خشخشی بال۔ جالی دار یا چوگوشیہ ٹوپیاں۔ کوئی چکن کی چپکن اور سلیم شاہی میں ہے۔ کوئی تن زیب کے انگرکھے اور زیرپائی پہنے ہے۔ خیر گاڑی سے اُتر کر ایک نے سٹک سنبھالی۔ ایک نے دری بغل میں ماری۔ ایک خالی ہی ہاتھ چلتے بنے۔ ایک بزرگ نے سردلی آموں کی ٹوکری دبائی۔ اتنے میں ہم میں سے کسی نے کہا کہ ہائیں! یہ تو خان بہادر میر ناصر علی بالقابہ ہیں۔ لو صاحب ذرا دیکھنا ان بڈھے بڈھوں کو بھی کیا سوجھی ہے۔ ساری بڑائی بالائے طاق رکھی اور مزے اُڑاتے پھرتے ہیں۔ مجھے ایک زمانے سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ مگر اب تک ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس لئے آگے بڑھا:-

میں۔ (مزاحاً) "میر صاحب آپ ناحق زیر بار ہوتے ہیں!"

مرحوم۔ (ہنس کر) "بھئی ایسا مزیدار بار بھی کوئی چھوڑ دیگا؟!"

توجناب اس مزیداری سے ہماری جان پہچان شروع ہوئی۔ جو بہت بڑھی۔ اور بڑی اچھی نبھی۔ دلّی چھوٹی تو پردیس سے نہ کبھی مجھے توفیق ہوئی کہ اُنہیں دو حرف لکھوں یا خیریت طلب کروں۔ نہ وہ لکھتے تھے۔ بلکہ یہ کہو کہ اُنہوں نے تو قطعاً لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ میں تو یہ کہا کرتا تھا کہ حضَت اخطِ خیریت بھیجا۔ احسان کیا۔ مگر میں جب تک خط نہ بھیجوں آپ سمجھیئے کہ خیریت ہے لیکن جب کبھی میرا خط پہنچے، تو سب کام چھوڑ کے اُسے پڑھئے گا کہ ضرور کچھ نہ کچھ بات ہے، جو خط لکھا گیا ہے۔ اس پر ہنستے اور فرماتے کہ بھئی تم تو حجتی آدمی ہو۔ تم سے کون بحثے۔ جو تمہارا جی چاہے کرو۔ تمہیں اختیار ہے۔ اب کے بھی دلّی گیا تو آخری مرتبہ

مل آیا تھا۔ اور جب تک وہاں رہا، دوسرے تیسرے ضرور ہو آتا تھا۔ کہ بڑے میاں چراغِ سحری ہیں۔ آج کل جوانوں کا ہی بھروسہ نہیں۔ تو چل میں آیا کا حساب ہے۔ ایک موت ہی تو ہے جو سستی ہوگئی ہے۔ نہ معلوم یہ حضرت بھی کب رخصت ہو جائیں۔ دلّی میں دو ایک ہی ایسے رہ گئے ہیں جنہیں اگلے وقتوں کی نشانیاں کہو۔ انہیں جی بھر کے دیکھ لو۔ ورنہ پھر یہ کہاں اور ہم کہاں۔ آخر وہی ہوا کہ کچھ مہینے پہلے حضرت فراق دہلوی ہم سے ہمیشہ کو رخصت ہوئے۔ آج سُنا کہ خان بہادر بالقابہ بھی جنّت سدھارے۔ اِنّا لِلّٰہ واِنّا الیہ راجعون۔ تو ہاں اخیر دفعہ ملا۔ بڑھاپے کے باعث گو وہ پہلی سی بات نہ رہی تھی۔ پھر بھی گھنٹوں بیٹھتے اور بٹھائے رکھتے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں سُنتے سُناتے۔ اور بہت خوش ہوتے تھے۔ اشعار کا تو خزانہ واقع ہوئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس غضب کی یاد تھی۔ دیوان کے دیوان نوکِ زبان تھے۔ اِدھر بات کی۔ اُدھر شعر پڑھا اور پھر ایسا برجستہ کہ سُننے والا دیکھتا کا دیکھتا رہ جائے۔ استعدادِ علمی کا بھی کیا پوچھنا۔ ایک دریا تھے جس کی شادابی سے اثنائے گفتگو علم و ادب کے شگوفے کھلتے رہتے تھے۔ اندازِ کلام بھی خاص رنگ کا تھا۔ جو اگلے زمانے کے بڑے بوڑھوں کا نمونہ تھا۔ باتوں میں وہ لطافت ہوتی تھی کہ انسان پہروں بیٹھا سُنے اور نہ اُکتائے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ لکھنے سے کہیں زیادہ اُن کے بولنے میں مزہ آتا تھا۔ دلّی کی شُستہ رفتہ ٹکسالی زبان بولتے۔ دم بدم اساتذہ کے شعر پڑھتے۔ اور الفاظ کو اس گھلاوٹ سے ادا کرتے تھے کہ جیسے بُلبل بول رہا ہے۔

لکھنے میں بھی مرحوم ہیٹے نہ تھے۔ لکھنے پر آتے تو بلاتکان صفحے کے صفحے لکھتے اور خوب لکھتے۔ "صلائے عام" میں انکے قلم سے جو کچھ نکلا میرے بیان کا شاہد ہے۔ اب تو اب یہ اب سے برسوں پہلے بھی اس میدان کے مرد تھے۔ ایک زمانے تک "تہذیب الاخلاق" سے اُلجھتے سُلجھتے رہے۔ جیسے سب جانتے ہیں کہ رسالہ کیا ایک اسرافیلِ ادب کا صور تھا جس کی زبردست آواز سے اور تو اور اُردو کے سوتے نصیب تک جاگ گئے! میرا اشارہ بہشت نصیب سرسیّد کی طرف ہے۔ اب ذرا آپ ہی خدا لگتی کہیئے کہ ایسے لائقِ احترام اور غیر معمولی انسان کی فتوحاتِ ادب پر مُنہ آنا اور سخن گسترانہ دوبدو ہو جانا کوئی معمولی بات تھی؟ مگر یہ تیرہویں صدی کی باتیں ہیں۔ ممکن ہے چودھویں صدی کو نہ بھائیں۔ خصوصًا اس لئے بھی کہ نئی روشنی کے متوالے پُرانے زمانے کی ساری باتوں کو فضول جانتے ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ کل تو کل مرحوم آج بھی بیگانہ نہیں۔ یہ بلا خوفِ تردید طبقۂ اوّل کے لکھنے والوں سے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ اخیر عمر میں ان کی طبیعت کا رنگ بدل گیا تھا۔ چہ جائیکہ بُڑھاپے میں ادب کو جوان ہونا چاہیئے۔ واقعی یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے لیکن میری دانست میں اسکی ذمہ داری مرحوم سے کہیں زیادہ سوسائٹی پر ہے۔ صاحب! ایک مرحوم کیا بیسوں ایسے مر مٹے اور بیسوں اس تمنا میں جیتے جی مردہ ہیں کہ سوسائٹی کو خالص علمی یا ادبی کاموں کی قدر ہی نہیں۔ اور سوسائٹی میں بھی وہی افراد سب میں زیادہ ناقدرے ہیں جو کھاتے پیتے ہیں۔ اور جن سے سب میں زیادہ توقعات ہیں۔ بلکہ یوں کیوں نہ کہیئے کہ یہ حضرات تو ایسے مشاغل کو ایک طرح کی دردسری سمجھتے ہیں۔ یہاں یہ بھی دیکھنا ہے کہ ان دریادلوں کا روپیہ کہاں نہیں خرچ ہوتا۔ مگر نہیں صرف ہوتا تو علمی کاموں میں! اب فرمائیے کہ مادّیت کے اس دور میں جس میں نرے توکل سے کام چلنا تو درکنار زر نیست عشق ٹیں ٹیں کا معاملہ ہو۔ کام چلے تو کیسے چلے۔ ایسے لیل و نہار میں ہوتا یہ ہے کہ اگر کسی منچلے نے دل کر کے قرض دام کیا اور بامید قدردانی

علمی کام میں خرچ کیا۔ تو سمجھو اس جسارت کے خمیازے میں ساہوکاری سود در سود سے اسے ایک دن جاں بحق تسلیم ہونا ہے۔ ویسے بھی نہ یہاں کوئی زاویہ علمی بلکہ دائرہ ادبی کہ انسان سب طرف سے کٹ کر وہاں کام کرے تو اسے اتنا مل جائے کہ باطمینانِ قلب کام کر سکے۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک تو دل کے دل میں رہ جاتی ہے۔ دوسرے کام کرنے والے رفتارِ زمانہ سے مجبوراً غیر فطری افعال پر اتر آتے ہیں۔ مثلاً کسی بدقسمت کو علم و فن سے مناسبتِ طبعی ہے تو سمجھ رکھیئے کہ اسے جینے کا حق نہیں۔ بلکہ بن آئی موت مرنا چاہیئے۔ ہاں اگر جان کی سلامتی چاہتا ہے تو اپنی وضعداری کا نشہ ہرن کرے۔ اور آرٹسٹ تمیع کی شوخیِ خیال کی تصویر مرقع بن کر رہے۔ یعنی اگر بہزادِ ہند ہے تو بورڈ رنگے، سحر نگار ہے تو کرایہ اگائے۔ رئیس التحریر ہے تو پان بیچے۔ اور بلیغ الملک ہے تو قلعی کرے! لیکن اس کے باوجود بھی ہم دیکھتے ہیں کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہیں۔ یعنی اس برے وقت بھی ایک دو اللہ کے لال اپنے کل آتے ہیں جو علم و ادب کی خدمت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں روپیہ پیسہ دیتے ہیں۔ جگہ دیتے ہیں۔ غرض اپنی مقدور بھر مدد دے کر چاہتے ہیں کہ کچھ مفید کام ہو۔ تو وہاں خوئی قسمت سے کارکنوں کی نیتیں بگڑی دیکھنے میں آئی ہیں۔ اور نام کو بھی خلوص باقی نہیں ہے۔ جسے دیکھو اس فکر میں نظر آئیگا کہ اپنا ہی پیٹ بھر لے اور رطب و یابس جس قدر بھی ہو کھپا کر سارا روپیہ خود ہضم کر لے۔ بس تو یہ اور اسی قسم کی اور بیسیوں باتیں تھیں جنہیں دیکھ دیکھ کر مرحوم کا دل بھی بجھ گیا تھا۔ اور ان کا لکھنا لکھانا مجبور ہو کر رہ گیا تھا جس پر افسوس کیا کرتے تھے۔ ورنہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جس طرح ان کی صورت نہیں بدل سکتی تھی۔ ان کے شمائلِ نفسی بھی اٹل تھے جن کے اظہار کا ادبی نام اسٹائل ہے۔

دور کیوں جاؤ۔ ساقی کے ہی دو ایک نمبر دیکھ لو۔ دو ایک نمبر اس لئے کہ خود میرے پاس زیادہ پرچے نہیں ہیں "صلائے عام" کی جلد بھی ایک صاحب لے گئے۔ اب ملنے کی بھی امید نہیں۔ جس سے شواہد پیش کر سکوں۔ کیونکہ جو کوئی کتاب لے جاتا ہے وہ واپس کرنا بیوقوفی سمجھتا ہے۔ اور میرے پاس کی یہ حالت ہے کہ اگر اور کچھ دن یہ مضمون نہ لکھتا ہوتا تو موجودہ پرچوں سے بھی ہاتھ دھولینا پڑتا۔ میں رہوں یا نہ رہوں میری اجازت ہو یا نہ ہو۔ میرے رسالے کتابیں میرے بعض دوستوں کی میراث ہیں۔ گویا میری ہوم لائبریری میرے دوستوں کا گھر ہے جس پر مجھے کوئی اختیار نہیں۔ ناچار جو مورد و موجود ہے۔ اسی میں سے تمثیلاً کچھ پیش کئے دیتا ہوں۔ تو خیر مرحوم ساٹھ برس کے تجربے کے بعد کہتے ہیں کہ "اردو لکھنی مشکل ہے"۔ کیونکہ اردو لکھتے وقت وہ ایسا طرزِ تحریر چاہتے ہیں۔

"جس سے انسان اپنا مطلب اس خوبی سے ادا کرے کہ اس سے بہتر کسی کے ذہن میں نہ آ سکے"

جو فصاحت کی آخری حد ہے۔ مرحوم کا یہ کہنا دراصل خوش بیان فلابرت کے اس عقیدے پر مبنی ہے کہ۔

"ہر چیز کے لئے ازل سے ایک ہی لفظ مقرر ہے۔ ایک ہی فعل ہے۔ جو خیال میں جان ڈال دیتا ہے۔ اور ہر موصوف کے لئے ایک ہی صفت ہے جس سے آگے ناممکن ہے۔ ہر جملہ میں اسی ایک اسم، اسی ایک فعل، اور اسی ایک صفت کی تلاش رہتی ہے"

واقعی یہی وہ چیز ہے جس سے انسان کی۔

"ادائے بیان حسینوں کے ہاتھ کی آرسی بن جاتی ہے جس میں ہر وقت اُن کا حُسن پیشِ نظر رہتا ہے"

اور جیسے مرحوم نے انگریزی، عربی، فارسی کی وسعتِ مطالعہ سے اتنی جِلا دی تھی کہ ان کا "حُسنِ بیان" بن گئی تھی۔ ساتھ ہی انہیں یہ بھی صاف معلوم ہو گیا تھا کہ:۔

"رنگِ رُوئے نگار اور ہے۔ اور رنگِ طپانچۂ رُخسار اور ہے۔ دمِ سرد اور ہے۔ اور ہوائے نسیمِ سحر اور ہے۔ چشمِ پرخون اور ہے۔ اور ساغرِ گلگوں اور ہے۔ غرض پپیہے کی بولی اور ہے۔ اور کوئل کی کوک اور ہے۔ اور یہی حال زبانوں کا ہے"

جن میں نظم کی مثال:۔

"ایسے گانے والی کی ہے۔ جس کی شکل اور آواز دونوں اچھی ہیں۔ نثر کے حسین ہونے میں بھی کلام نہیں۔ مگر آواز نکالتے ڈرتی ہے۔ کہ کوئی غیر نہ سُن پائے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ اس کی آواز ہی اچھی نہیں۔ پاٹ دار آواز اور شوخیِ نگاہ بھی غضب ہے۔ مگر دبی بات اور لجائی چتون کا کیا کہنا"

مرحوم کو حُسنِ بیان کی کچھ ایسی چیٹک ہو گئی تھی کہ کئی کئی زبانوں کے جاننے کے باوجود بھی کہیں اور اچھی چیز دیکھ پاتے تو اس سے اُردو کو سج کے رہتے۔ ہندی زبان میں گو دخل نہ تھا۔ چنانچہ "نوائے طوطیانِ ہند" قلمبند کرتے ہوئے اسے خود تسلیم کیا ہے۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ:۔

"ایک زبان کی خوش بیانی دوسری زبان میں ادا ہونی مشکل ہے کہ بوئے مشک کی طرح ایک ڈبہ سے دوسرے میں لاتے لاتے اُڑ جاتی ہے۔ اور گلاب کو ایک قرابہ سے دوسرے میں ڈالئے تو کم ہو جاتا ہے"

پھر بھی دل نہیں مانتا۔ آخر ہندی آسمانِ ادب کے چند تارے توڑ ہی لاتے ہیں:۔

"ایک دوہے میں کسی نے دن میں رات کو ثابت کیا ہے۔ یار سیاہ چونری جو سپید گلدار ہے پہنے ہوئے ہے۔ سیاہ چونری کی زمین تو گویا اندھیری رات ہے۔ اور ستارے سپید گل ہیں۔ مانگ کی صفائی و خوبی کہکشاں کا جواب ہے۔ چہرہ ماہتاب سے کسی طرح کم نہیں۔ پھر دن میں رات نہ ہو تو کیا ہو"

دن ہو گی رات پیارے کیا چُھپ کے آؤ گے تم ہر نقشِ پا زمیں پر اک آفتاب ہو گا!

"بے ہنر آدمی ہنرمندوں میں رہنے سے بڑی جگہ پہونچ جاتا ہے جس طرح ڈھاک کا پتہ پان کے ساتھ حسینوں اور رانیوں کے ہاتھ تک جا پہنچتا ہے"

"اچھے آدمی تکلیف پانے سے بھی اپنی بھلائی نہیں چھوڑتے۔ جیسے صندل کہ صندل کو چاہے جتنا گھسو خوشبو ہی دیگا۔ اور پھل دار درخت پتھروں سے مارنے پر بھی پھل ہی دیتے ہیں"

"چکوروں کو چاندنی رات بھاری ہوتی ہے۔ اس پر کسی نے خوب کہا کہ چہرۂ تاباں کے سامنے سے چکوروں کو ہٹا دو
کہ کم بختوں کو چاند کا دھوکہ ہو رہا ہے۔"

بالائے بام آج وہ دیکھیں گے چاندنی بھاری ہے چاند چودھویں شب کا چکور پر!

"یار کے چہرے کا جواب پیدا کرنے کی فکر خلاقِ دو عالم کو ہوئی۔ تو جواب میں چاند کا نقشہ ذہن میں آیا۔ روز ازل سے
اس پر مشق شروع کی۔ کبھی گھٹایا، کبھی بڑھایا، غرض بنایا اور مٹایا مگر اب تک پورا نقشہ نہ بن سکا۔"

لیکن ان نازک خیالوں کی داد دیتے دیتے یہ کام کی بات بھی نہیں بھولتے کہ:۔

"اُردو میں اسی ملک اور اسی آب و ہوا کے موافق خیالات کا اثر زیادہ ہو سکتا ہے۔ مشغلۂ عشق و محبت کی طرح
زبان کے معاملہ میں شیخ و برہمن کا امتیاز نہیں۔ دیر و حرم کی بحث نہیں۔ اُردو ادب کو ان جھگڑوں سے واسطہ
نہ رکھنا چاہیئے۔ لیلیٰ اچھی تھی تو دمن کیوں اچھی نہیں۔ شیریں کی تعریف منظور ہے تو ہیر کی تعریف بھی ضرور ہے۔"

تصویرِ حُسن رنگ بدلتی ہے جا بجا عذرا کہیں بنی تو کہیں ہیر بن گئی!

قصہ مختصر ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ مرحوم ایک نازک خیال شاعر و نثر ہیں۔ ان کی ہر بات پری ہوتی ہے جو
علم کے زیور سے آراستہ اور دلی کی شاہانہ اُردو بولتی ہے۔ یہ بات ان کے ہاں ہمیشہ رہی۔ جوانی گئی۔ بڑھاپا آیا تب بھی طبیعت
کا چونچلا اور شگفتگی نہ گئی۔ ایک جگہ "بڑے میاں" بنے بیٹھے ہیں۔ علائقِ دُنیا دامنگیر ہیں۔ جن کے باعث "غمِ زندگی" کا سامنا ہے
کہ آدھی رات ڈھل گئی۔ اور آنکھ نہیں لگی۔ اتنے میں کیا ہوا کہ کسی نے دستک دی:۔

بڑے میاں:۔ "کون؟"

آواز:۔ "میں ہوں شہرت! جس کی تلاش میں اک جہاں سرگرداں ہے۔ میرا مزاج بچوں کا سا ہے۔ کبھی تو بُلانے
پر بھی نہیں آتی۔ کبھی بن بُلائے گلے بیاں ڈال دیتی ہوں۔"

بڑے میاں:۔ "اب ہم تو تھکے ماندے پڑے ہیں۔ تمہارے لئے کون اُٹھے!"

آواز:۔ "نہیں جی میں تو بہکا رہی تھی شہرت نہیں ہیں جوانی ہوں۔"

بڑے میاں:۔ "جوانی؟!! ارے بی جوانی! وہ دن گئے۔ وہ باتیں گئیں۔ اب تو اگلے وقتوں کا ذکر جانے
ہی دو۔"

اس کے بعد یہ آواز شعر و سخن بنتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ میں تمہاری دمساز ہوں۔ تم سے باتیں کرنے آئی ہوں:۔

ابھی ساقی چھٹا دامن نہ ہم سے!

لیکن اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ نہ وہ اب پہلا سا دل ہے۔ نہ دماغ ہے۔ مدت ہوئی کہ دونوں رُخصت ہو گئے۔ یہ سُنکر آواز
نے دولتِ دُنیا کا فریب کیا۔ مگر جواب ملا کہ دیر کر کے آئی! جس پر آواز کُھل کھیلتی ہے، اور کہتی ہے کہ:۔

"جناب عالی! میرا نام موت ہے!! اتنی آوازیں جو تمہارے کان میں آئیں۔ اُن سے یہی غرض تھی کہ آخر فنا ہے!!"

دو اور مضمونوں میں بھی موت کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"موت بوڑھے کو یہ راگ سُنا رہی ہے کہ بہشت کی حوریں تیرے انتظار میں ہیں !"

ایک جگہ انہیں اس طرح "حسنِ عروسِ اجل" نظر آیا کہ نورِ عرفان سے ان کا سینہ چراغاں ہے۔ اور یہ القا ہو رہا ہے کہ کائنات بھی حسین اور اس کا پیدا کرنے والا بھی حسین !۔

"خالقِ دوجہاں احسن الخالقین ہے۔ جس نے کوئی شے بدصورت پیدا ہی نہیں کی"

اسی حُسنِ محض کی پیدا کی ہوئی ایک اجل بھی ہے :-

"جس کے چاہنے والے کو کسی نے جاں بر ہوتے نہیں دیکھا۔ مگر اس کا سہاگ حشر تک مٹتا نظر نہیں آتا۔ اسکے سوگ کا جوڑا سہاگ کا جوڑا ہے۔ جو کفن کی طرح ایک ہی رنگ کا چلا آتا ہے !"

دیکھنا کیا بات کہی ہے اور کس مزے اور رکھ رکھاؤ سے کہی ہے کہ اس کے آگے یونانی نازک خیالی بھی مات ہے۔ موت کا مضمون مگر فسانۂ حُسن ! سارے بیان میں ایک مقناطیسی اثر ہے کہ دل کھنچا جاتا ہے۔ ہائے اُن کے پاس تو :-

موت بھی آئی تو دُلہن بن کے شرمائی ہوئی !

خیر تو جیسا میں نے پہلے کہا مرحوم دُنیائے اُردو کے صفِ اوّل میں تھے۔ بلکہ اس لئے تو مغتنمات سے تھے کہ دلی کی اُجڑی صحبتوں کی یادگار تھے جنہیں بادشاہت نے نوازا تو ایشیائی تہذیب نے پروان چڑھایا تھا۔ اور سچ پوچھتے ہو تو انہیں صحبتوں سے کبھی دلی دلی تھی۔ فقط اینٹ پتھر کا نام نہ تھی۔ اب کہ ترقی کا ہر قدم آگے کو ہے تو ہوا کرے۔ قدیم تہذیب کی رینی میں مرحوم کی طبیعت پر بھی جو رنگ رچا اپنی ذاتی سج دھج اور رسبھاؤ سے ایسا ہے کہ محفوظ رکھا جائے۔ یہ آنے والوں کے لئے نمونہ ہوگا۔ اور کچھ دن بعد ناپید ہو جائیگا کہ حُسن کے یہ رسیا بہت زیادہ اُٹھ گئے۔ بہت کم باقی ہیں۔ جو باقی ہیں وہ کوئی دن کی ہوا کھا رہے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے یہ بھی نہ رہیں گے۔ اللہ کا نام رہ جائیگا۔ اس لئے یہ مانا کہ مرحوم کی کوئی ایسی مُستقل تالیف یا تصنیف نہیں جو اُن کی زبردست علمی اور ادبی قابلیت کی بولتی تصویر ہوتی۔ رہے ان کے متفرق مضمون تو ظاہر ہے ان میں قدرتی طور پر ایک مرتب کتاب کا ساوزن نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی ان کے نئے پُرانے کئی مضمونوں میں وہ جوہر ہے جس میں ادبِ اعلیٰ کی شان ہے۔ بس تو زوائد نکال کر جو مرحوم کیا دُنیا کے اچھے سے اچھے لکھنے والوں کے ہاں بھی ہیں۔ جس طرح ہو ان کا انمٹ حصّہ ادبی یکجا کر لینا ہے۔ جو اب تک یہاں وہاں ہے۔ اس کام کے لئے نظریں سب سے پہلے شاہد و انصار کی طرف اُٹھتی ہیں۔ اور بڑی خوشی ہوگی کہ ادب کے ان بکھرے پھولوں کا جلد تر ایک خوشنما گلدستہ بن جائے !۔

"جب تک ایک زبان اور مستقل زبانوں کے ذخیرہ کو نہ پہونچے کسی نہ کسی معتبر زبان کا سہارا لینا پڑیگا۔ فارسی و ہندی کا سہارا ابتک کام آیا۔ عربی و سنسکرت زبانوں کا لیا گیا تھا۔ لیکن سنسکرت مردہ زبانوں میں داخل ہے اور عربی مشکل ہے۔ اس زمانہ میں نگاہ جاتی ہے تو انگریزی پر کہ یہ مناسب وقت ہے۔ اسکی تعلیم خاصی رائج ہو رہی ہے اور روز بروز ترقی پر ہے۔"

ناصر علی

May you persevere
in your good Con-
-duct! is the prayer
of your old aged
grand father who
has passed his days
pretty well & has
nothing to Complain
in this world.

M. Nasir ali.

میر صاحب مرحوم کے لٹریچر پر ایک اجمالی تقریظ

خان بہادر میر ناصر علی صاحب مرحوم دہلی کے ایک مشہور خاندانِ سادات کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد ماجد مولوی سید ناصر الدین محمود ابو المنصور امام المناظرہ ارباب علم و فضل میں نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔ یوں ذوقِ علم میر صاحب کی گھٹی میں پڑا تھا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں ہوئی اور مذہبی کُتب آپ نے اپنے والد ماجد سے سبقاً سبقاً پڑھیں، یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریزی پڑھنا کفر اور پڑھنے والا کافر سمجھا جاتا تھا چنانچہ فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میر صاحب نے دہلی کالج سے انٹرنس پاس کیا اور فوراً ہی نان پارہ میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ میر صاحب کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں تاہم بہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے کسی کالج میں باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل نہیں کی۔ یہ اُن کا ذاتی شوق تھا کہ انھوں نے کثرتِ مطالعہ سے اتنی اچھی استعداد پیدا کر لی کہ جملہ عُلوم و فنون میں، جو اُس وقت تک مغربی زبانوں کے لئے مخصوص تھے، اُنھیں کامل دسترس تھی اور ادب و فلسفہ میں تو گویا ماہر تھے۔ میر صاحب کی زندگی سلف ہلپ اور سلف اسٹڈی کی عمدہ مثال تھی کہ باوجود ناسازگار واقعات کے اُن کا ذوقِ فطری بڑھتا ہی گیا۔ بدبخت ہندوستان میں ادیب و انشا پرداز کو وہ آسائشیں کہاں میسر جو یورپ میں ادب و انشاء کے دلدادگان کو حاصل ہیں۔ میر صاحب نے جو کچھ لکھا ایک ایسے ماحول میں لکھا جس کے بلسے میں مشہور ہے "ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" عمر کا بہترین حصّہ سرکاری مُلازمت اور وہ بھی محکمۂ نمک کی کھکیڑ اُٹھانے میں صرف ہوا۔ ان نامساعد واقعات میں میر صاحب نے اپنے بیشتر مضامین لکھے اور آج اُن کی تعداد و نوع کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ اتنا زیادہ اور اتنا اچھا لٹریچر اس قدر ادب کُش فضا میں کیسے اُن کے قلم کے سایہ میں نکلا۔ کاش وہ دماغ جو خالصتاً لٹریچر کے لئے بنایا گیا تھا لٹریچر ہی کے لئے وقف ہو جاتا تو آج ہماری زبان اسدرجہ کم مایہ کیوں نظر آتی کہ ہندی بھی اُس کے مُنہ آ رہی ہے!

جس مُلک میں لٹریچر ایک ایسا لفظ ہو جو کبھی شرمندۂ معنی نہ ہوا وہاں بھلا لٹریری ہیروز کو کون پوچھتا ہے؟ ہمارے ہموطن مکروہاتِ دُنیا و تفکّراتِ روزگار میں اس قدر مُبتلا ہیں کہ اپنے لٹریچر کی قدردانی تو کجا اُس کی طرف توجّہ کرنے کا بھی اُنھیں خیال نہیں آتا۔ لٹریچر کی اہمیت کا اندازہ اِس سے لگایا جا سکتا ہے کہ قومی ترقی و تنزّل میں اِسے بہت دخل ہے بلکہ بعض کا تو خیال یہ بھی ہے کہ اگر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہے تو صرف اپنے لٹریچر کی قدردانی ہی سے کیونکہ لٹریچر کی ترقی سے قوم کی ترقی کا اندازہ لگایا جاتا ہے کہ لٹریچر قومی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں اوّل تو لٹریچر ہی کیا ہے اور جو کچھ بھی ہے اُسی کی کونسی قدر کی جا رہی ہے؟ اور زبانوں سے اُردو کو ملا کر دیکھئے تو خالی ہاتھ نظر آئیگی۔ انشا پرداز "ہرت بر گھاس" کی مثال

پیش کرتا ہے اور پبلک ایک سرے سے اُسے لائقِ توجہ ہی نہیں سمجھتی۔ وزیر بے چُنیں، شہریار بے چُناں! پھر بھلا اقلیمِ سخن اپنے ہاتھ میں رہے تو کیسے رہے؟

جہالت و فلاکت زدہ قوم کی علامت یہ ہے کہ اُس کے کسی شعبۂ حیات میں نہ تو کوئی ہیرو (محمد حسن) ہوتا ہے اور نہ قوم میں جذبۂ ہیرو پرستی۔ ہیرو کا وجود اس لئے ضروری ہے کہ یہ اُس شمعِ ہدایت کا کام دیتا ہے جو ادبار کی ظلمتوں میں سے راہِ نجات دکھاتی ہے۔ یہاں سیاسیات سے مجھے بحث نہیں۔ ادبیات کو دیکھئے کہ ہم نے اپنے لٹریری ہیروز کی کیا قدر کی؟ سر سیّد احمد خاں اگر علی گڈھ کالج اپنی یادگار نہ چھوڑ جاتے تو آج اُن کا نام بھی مٹ چُکا ہوتا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ٹکسالی اور بامحاورہ اُردو میں کلامِ مجید کا ترجمہ کیا تو مذہبی پیشواؤں نے اُنہیں بازاری زبان لکھنے والا ٹھہرایا اور ایک متعصب عیسائی کے اعتراضات کا مُسکت جواب لکھنے پر اُنہیں کفر کے فتوے سے سرفراز فرمایا۔ شبلی سا نقّاد اگر یورپ میں پیدا ہوتا تو آج تک اُس کا نام پُجتا۔ آزاد کی انشا پردازی کی دھاک صرف اُن کی زندگی تک محدود رہی۔ آج "آبِ حیات" کو تقویمِ پارینہ قرار دینا ہر تذکرہ نویس کے فرائض میں داخل ہے۔ حالیؔ نے قومی نظموں کا صُور پھونکا مگر نیند کی متوالی قوم نے صرف ایک کروٹ لی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

غرض ایک طویل فہرست ایسے ہیروز کی پیش کی جا سکتی ہے جنہوں نے محض ذاتی شوق کی بنا پر اپنی زندگی خدمتِ علم و ادب کے لئے وقف کر دی تھی۔ مگر جس قوم نے اُن کا نام مٹانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ میر صاحب کا لٹریچر بے قدری کے ہاتھوں "نقش و نگارِ طاقِ نسیان" بہت کچھ ہو چُکا اور جو باقی ہے وہ بھی قوم کے ناقدر شناس ہاتھوں میں پڑ کر فنا ہو جائیگا۔ ہیرو پرستی کی کیسی نادر مثال ہے! یہ ہے ہماری اور ہمارے مُلک کی حیاتِ ادبی! اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ علم و ادب کے باب میں زندہ قوم کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں تو سات سمندر پار کے باشندوں کو دیکھئے کہ زندگی میں اہلِ کمال کی جیسی قدر ہونی چاہیئے تھی ویسی ہی ہوئی اور مرنے کے بعد بھی اُن کی قدر و منزلت اس سے ثابت ہے کہ "ویسٹ منسٹر ایبی" میں اُنہیں جگہ ملی۔ پبلک میں سینکڑوں انجمنیں اُن کے ناموں سے قائم ہوئیں اور متعدد مجسّمے بطور یادگار نصب کئے گئے۔ کئی کئی صدیاں بیت جانے پر بھی ان کی قدردانی میں فرق نہیں آنے پاتا۔ شکسپیئر کی برسی جس شان سے یورپ میں منائی جاتی ہے ہیرو پرستی کی اعلیٰ مثال ہے۔ گیٹے کی صدسالہ یادگاریں آپ نے خود دیکھ لیا ہو گا کہ زندہ قوم کا کونسا جذبہ کارفرما تھا اور پھر کس شدّت کے ساتھ! مُردہ قوم کی بدترین مثال اگر دیکھنی ہو تو نظام الدین میں غالبؔ کی ٹوٹی ہوئی قبر دیکھئے جس پر بے کسی آنسو بہاتی اور ویرانی ماتم کرتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار! پھر اگر کسی انگریز شاعر نے "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ اور ان دونوں کا اتصال کبھی نہیں ہو سکتا" کہا تو کیا بیجا کہا اور آپ چراغ پا کیوں ہوں؟ بُعدالمشرقین آپ کی نظروں کے سامنے موجود ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ آنکھوں پر سے غفلت کے پردے ہٹا کر اپنی ناقدری کا عبرت آموز منظر دیکھ لیجئے

غرض قوم کی اس ناقدری کا رونا کوئی کہاں تک روئے۔ لہذا پھر نفسِ مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں۔
میر صاحب نے اُس وقت قلم ہاتھ میں لیا جبکہ "تہذیب الاخلاق" کا شباب تھا۔ سرسید احمد خاں اور اُن کے رُفقاء کے ہنگامہ پرور مضامین کے جواب میں میر صاحب نے مضامین لکھنے شروع کئے اور یہ مضامین کچھ اسدرجہ مطبوعِ خلائق ہوئے کہ ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدائیں آنے لگیں۔ یہی چیز تھی جس نے میر صاحب کے جوہرِ خاص کو اُبھارا اور اُنہیں زیادہ لکھنے لکھانے پر اُکسایا۔ ابتدائی مضامین گو مذہبی تھے تاہم میر صاحب کے اسلوبِ بیاں نے لٹریری خوبیوں سے اُنہیں اس قدر بھر دیا تھا کہ اُن کا ایک ایک فقرہ آج تک نازک خیالی و پاکیزہ بیانی کی جان سمجھا جاتا ہے۔ ہزاروں پولٹیکل انقلابوں اور سینکڑوں کروٹوں کے بعد اسلام نے جو صورت اختیار کی اس میں نئی روشنی کے مطابق اصلاح و ترمیم پر میر صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن کا مختصر سا اقتباس "تیرھویں صدی" میں سے درج ذیل کرتا ہوں تاکہ میر صاحب کے ابتدائی لٹریچر کا نمونہ آپ ملاحظہ فرمالیں:۔

اُس خیال سے کون ہے جسے اپنا اسلام عزیز نہ ہو؟ تیرہ سو برس کا ساتھ بھی کہیں چھوٹتا ہے؟ نئے ولولے نیازِ قدیم کو کب پہونچتے ہیں؟ نئی ملاقاتوں میں پرانی محبتیں کب چھوٹتی ہیں؟ نئی روشنیاں شعاعِ آفتاب نہیں مٹاتیں۔ تیرہ سو برس کے عقیدوں کو ایجادِ بندہ کیا کرے؟ نئے خیال جمی باتوں کو اُکھاڑ چکے۔ پُرانی جڑیں تازہ صدموں سے نہیں ہلتیں۔ نئے رنگروٹ پُرانے سپاہیوں کو نہیں پہونچتے۔ وہ اور ہیں جنہیں تازہ ہوا سے خللِ دماغ ہوتا ہے۔ وہ اور ہیں جو دوڑتے ہیں اور گر پڑتے ہیں۔ بادِ مخالف میں جو جہاز چلے اسکا اعتبار نہیں۔ مصائب میں جو کسی کا ساتھ چھوڑ دے وہ آدمی نہیں۔ لڑائی میں جو دشمن سے جا ملے کمینہ ہے۔ اور خود کشتوں کی طرح جسنے کسی نئے ولولے میں ساتھ چھوڑا وہ حیز ہے جو لشکر چھوڑ کر بھاگا"

"تیرھویں صدی" میں اِس قسم کے بہت سے مضامین ہیں۔ اسکو مُشتے نمونہ از خروارے سمجھیئے۔ میر صاحب کے وہ مضامین جو "تیرھویں صدی" میں شائع ہوئے ہیں اپنے محاسن کے اعتبار سے اُردو علم و ادب میں ایک گرانمایہ اضافہ ہیں۔ میر صاحب کے مضامین کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ ان کا اقتباس نہیں پیش کیا جا سکتا۔ ہر مضمون اسقدر جامع اور مکمل ہوتا ہے کہ کہیں سے کسی ایک فقرے کو بھی چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اگر ایک اینٹ بھی نکالی جائے تو مضمون کی ساری عمارت مُنہدم ہو جاتی ہے۔ پھر ہر مضمون میں اتنے جواہر ریزے ہیں کہ جب اُن میں سے کچھ چُن کر کوئی آگے بڑھتا ہے تو اور بھی بہتر جواہر پارے نظر آتے ہیں اور ان میں سے بھی کچھ چھانٹنے پڑتے ہیں۔ غرض یونہی چُنتے چُنتے دامن بھر جاتا ہے اور عرصۂ مضمون طے کرنے سے پہلے ان کے بوجھ سے دامنِ انتخاب پھٹ جاتا ہے اور جواہر ریزے وہیں کے وہیں رہ جاتے ہیں!

یہ ان کے لٹریچر کی وہ خوبی ہے جو صرف مغربی اعلیٰ لٹریچر میں پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مضمون میں اقتباسات سے میر صاحب کے لٹریچر کی وضاحت نہیں کی جاسکی۔

لٹریچر کا صحیح مفہوم میر صاحب نے خوب سمجھا اور سمجھایا۔ اسکے ثبوت میں اُنکے وہ تمام مضمون پیش کئے جاسکتے ہیں جو لٹریری خوبیوں سے بھرے پڑے ہیں۔

"لٹریچر" کا لفظ اپنے اندر اس قدر وسیع مفہوم پنہاں رکھتا ہے کہ آج تک اسکی جامع تعریف نہ ہوسکی۔ مختصراً اسے یوں سمجھئے کہ لٹریچر سے انسان کے دل و دماغ کے راز معلوم ہوتے ہیں۔ لٹریچر خیال کا ذریعہ اظہار ہے۔ خیال کی وسعتیں اسی سے ظاہر ہیں کہ ــــ عالم تمام عرصۂ دامِ خیال ہے۔ اسکے رازوں کو بیان کرنے کے لئے لٹریچر کی ضرورت ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ــــ ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال۔ اِس محشرِ خیال کو اپنے دل و دماغ سے دوسرے کے دل و دماغ تک پہونچانا بغیر لٹریچر کے ممکن نہیں۔ خیال کا ایک سرا ازل میں اور دوسرا ابد میں ہے۔ انسان کو خیال اس لئے دیا گیا ہے کہ ازل سے ابد تک اسکی پہونچ ہے۔ جسے چاہے اُسکے ذریعہ اپنے قابو میں لائے۔ "لٹریچر" اظہارِ خیال کا ذریعہ ہے، گویا ازل سے ابتک اور اب سے ابد تک جو کچھ ہمارے خیال میں آیا اور آئیگا لٹریچر کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔

دُنیا عیش و نشاط۔ غم و رنج۔ آسائشوں اور تکلیفوں کا مسکن ہے مگر حیاتِ انسانی میں عیش کم اور غم زیادہ ہوتا ہے۔ "لٹریچر سے عیش کا لُطف بڑھ جاتا ہے اور غم اگر جاتا نہیں تو کم ضرور ہوجاتا ہے" یہ غایت ہے لٹریچر کی۔

لٹریچر کی توضیح میر صاحب نے اپنے اکثر مضامین میں کی ہے جستہ جستہ اقتباسات درج ذیل ہیں جن سے لٹریچر کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے:۔

> "میری غرض لٹریچر سے یہ ہے کہ انسان کے خیالات ہر رنگ میں اُتارے جائیں اور اس طرح کہ بیکانگی اور ابتذال سے بچے رہیں۔ جس فن میں جو خوبیاں ہوں وہ ادائے بیان میں دکھائی جائیں، موسیقی کی طرح دلکش ہوں جسکے سُننے کو بے اختیار جی چاہے۔ تصویر کا سا عالم ہو کہ نگاہ ہٹانے کو جی نہ چاہے، جس طرح عمارتوں میں "روضۂ تاج گنج" اور گانے میں تان سین" کی آواز۔ مشروبات میں بادۂ انگور۔ ایسی نثر جو نظم سے زیادہ موزوں و پاکیزہ ہو، اور ایسی نظم جسپر الہام و وحی کا گمان ہو"

"لٹریچر سے قوم و ملک کی عزت سمجھئے، فردوسی کی وجہ سے ایران کی شہرت ہوگئی، ہومر سے یونان کی۔ سکونتلا سے سنسکرت کا نام روشن ہوگیا اور مقاماتِ حریری سے عربی زبان کا۔ دُنیا کی قوموں اور سلطنتوں کی یادگار یہی ایک چیز ہے جسے لٹریچر کہتے ہیں"

"لٹریچر محض نقل کرنے کا نام نہیں۔ لٹریچر کا کام پیدا کرنا ہے کہ نازک خیالیاں اور پاکیزہ بیانیاں

پیدا کی جائیں"

"اوّل تو اُردو میں لٹریچر پیدا کرنے کی شروع سے کوشش کی نہیں گئی۔ دوسرے انگریزی لٹریچر کے سامنے رہی سہی جو کچھ تھی وہ بیقدری کی نذر ہو گئی۔ اِس وقت اُردو میں جو کچھ لکھا جاتا ہے بگڑا ہوا انگریزی لب و لہجہ ہے"

"محض لٹریچر کے خیال سے کوئی کتاب عرصہ سے نہیں لکھی گئی۔ لٹریچر کو میں انسان کی زندگی سے اِس طرح وابستہ سمجھتا ہوں جس طرح ناخن کو گوشت سے۔ حنا کو رنگ سے۔ نگاہ کو اچھی شکل سے۔ دُنیا جیسی ہے ویسی دکھانا لٹریچر کا کام ہے"

میر صاحب کے لٹریچر کی غرض و غایت کا بھی ایک حد تک ان اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے۔

خان بہادر میر ناصر علی مرحوم نے انگریزی اور فارسی لٹریچر کا بہت وسیع مطالعہ کیا اور اُردو لٹریچر میں ایک وضع خاص پر مضامین لکھے۔ انگریزی اور فارسی کے بہترین اسالیب اُنہوں نے اُردو میں بھی رائج کر دکھائے۔ ان کا طریقۂ فکر وہی تھا جو غیر زبانوں کے اعلیٰ انشا پردازوں کا رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انکے مضامین علوِ خیال و نزہتِ بیان کے اعتبار سے آج اپنا جواب نہیں رکھتے۔ نثر لکھنے میں اُنہیں کمال حاصل تھا اور ان کی غیر معمولی قابلیت کے اظہار کے لئے نثر ہی موزوں تھی۔ ترقیٔ زبان کے لئے نظم سے زیادہ نثر کی ضرورت ہے۔ ہماری زبان بہ اعتبارِ نظم مکمّل ہی نہیں بلکہ اکثر زبانوں سے پیش پیش ہے مگر نثر کے لحاظ سے اس میں ابھی ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ اسکی کیفیت میر صاحب نے خود یوں لکھی ہے۔

"ہر طرح کے علوم و فنون میں ترقی کرنے کا ذریعہ نثر میں ہے۔ نظم میں صرف ایک فن شعر و شاعری کی گنجائش ہے۔ اور وہ بھی اکثر عاشقانہ۔ وہی پُرانی لکیر پیٹے جانا ہر طرح کی معلوماتِ علمی کے لئے کافی نہیں۔ شعر و شاعری اکثر غیر زبانوں سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہے۔ نثر میں مَیں دیکھتا ہوں کہ ہم اور زبانوں سے گرے ہوئے ہیں"

یہی وجہ تھی کہ میر صاحب نے نثر کو اختیار کیا اور اس میں اور زبانوں کی سی لطافتِ خیال پیدا کرنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئے۔ انکی نفیس مشاطگی نے عروسِ ادب کو نِک سے سُک بنایا اور دُنیا نے دیکھ لیا کہ ہماری زبان کی نثر بھی کسی اور زبان کی نثر سے ہیٹی نہیں رہ سکتی۔ خالص ادبی مضامین میں فلسفہ کی چاشنی سب سے پہلے میر صاحب ہی نے دی۔ یہ اثر تھا اُس مغربی لٹریچر کا جس کا مُطالعہ اُنہوں نے کثرت سے کیا تھا۔ فلسفیانہ نکات کو بیان کرنے کے لئے اُنہوں نے آسان پیرایۂ بیان اختیار کیا اور اس انداز کو زیادہ دلنشین بنانے کے لئے فارسی لٹریچر کی وہی تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے جو اُردو میں مُروج ہیں۔ میر صاحب کا لٹریچر "خذ ما صفا دع ما کدر" کی اعلیٰ مثال ہے کہ نازک خیالی مغربی لٹریچر سے اور پاکیزہ بیانی مشرقی لٹریچر سے اخذ کر کے اُنہوں نے نثرِ اُردو میں ایک نئی شاہراہِ خیال قائم کی مگر افسوس! اس دل و دماغ کا صرف

ایک ہی آدمی پیدا ہوا اور وہ بھی اب ہم میں نہیں رہا۔

میر صاحب کو جو چیز اور انشا پردازوں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا اسٹائیل ہے جو اس سے پہلے کہیں دیکھنے میں نہیں آیا اور نہ اُمید ہے آئندہ کوئی اس طرز کو اختیار کر سکیگا۔ ان کا اسٹائیل اُردو لٹریچر میں اپنی نوع کی پہلی اور آخری چیز ہے۔ میر صاحب اپنے اسٹائیل کے مُوجد بھی تھے اور اختصاصی بھی جس سانچہ میں یہ اُسلوب ڈھلا تھا اس میں کوئی اور نہ ڈھل سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قُدرت نے اس قسم کا صرف ایک ہی اسٹائیل ڈھالا اور اس کے بعد سانچہ توڑ دیا۔

میر صاحب کے اسٹائیل کی دو نمائیاں خصوصیات ہیں۔ ایک نازک خیالی اور دوسری پاکیزہ بیانی، اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو ہر قوم کے معیاری لٹریچر میں پائی جاتی ہیں۔ ہماری زبان میں بہت کم صاحب طرز ایسے ہوئے جنکی تحریروں میں یہ دونوں خوبیاں پہلو بہ پہلو نظر آتی ہوں۔ کسی نے زبان کی پیروی میں ساری عمر کھپا دی، اور کوئی خیال کے پیچھے زبان کا لحاظ نہ رکھ سکا۔ یہ بات کم کو نصیب ہوئی کہ ان کی تحریروں میں یہ دونوں خوبیاں زُلف و شانہ نظر آتی ہوں۔ میر صاحب نے ابتدا ہی سے ان دونوں کا لحاظ رکھا اور یہ اُنہی کا جامہ تھا کہ مرتے دم تک اِنہیں نبھائے گئے۔ خیال چونکہ پہلے پیدا ہوتا ہے اور اسکے بیان کے لئے بعد میں زبان کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے لٹریچر میں خیال بمقابلۂ زبان زیادہ وقیع ہے۔ خیال کی مثال زُلفِ یار سمجھیئے کہ اسکی پریشانی میں بھی حُسن ہوتا ہے۔ زبان اسکی مشاطہ ہے جو اسے بنا سنوار کر دُلہن بنا دیتی ہے۔ عروسِ جمیل یونہی کچھ کم دلکش نہیں ہوتی، اور اگر اسکے ساتھ لباسِ حریر بھی ہو تو کیا کہنا۔ یا بیان کو جسم اور خیال کو روح سمجھیئے کہ جسدِ بے روح خواہ کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو کسی کو نہیں بھاتا۔

انگریزی میں اسٹائیل کو لٹریچر کی جان سمجھتے ہیں۔ ہماری زبان میں اسپر بہت کم زور دیا گیا۔ نظم میں اچھے اچھے اندازِ بیان اختیار کئے گئے۔ اساتذہ کا کلام دیکھ لیجئے کہ ایک ہی موضوع پر لکھنے کے باوجود ہر اُستاد کا کلام دوسرے سے جُدا نظر آتا ہے۔ انیس و دبیر۔ میر و میرزا کی خوبیاں محتاجِ بیان نہیں مگر نثر میں اسکی کمی رہ گئی اور یہ کمی اب بھی چلی جاتی ہے۔ نثر نگاری کی ابتدا بھی نظم کی طرح فارسی کی تقلید میں ہوئی مگر نظم کو یہ بات راست آگئی اور نثر میں زیادہ نہ نبھ سکی۔ اُردو نثر کے لئے انگریزی نثر زیادہ مناسبِ حال ثابت ہوئی بلکہ ایک مُحقق نے تو یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ انگریزی لٹریچر ہی کی اثر اندازی سے نثر اُردو کی ابتدا ہوئی۔ میر صاحب نے بھی اپنے مضامین کے لئے مغربی لٹریچر کو نمونہ بنایا اور اُردو میں بھی وہی وضع اختیار کی جو ایڈیسن بالزک۔ گولڈ اسمتھ۔ آسکر وائلڈ جیسے شُہرۂ آفاق ادیبوں نے اختیار کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انکے مضامین میں ایسے خیالات کی کثرت ہے جن سے اُردو زبان قطعاً نا آشنا تھی، تقلید کوئی بُری چیز نہیں بشرطیکہ اچھی چیز کی تقلید کی جائے۔ میر صاحب نے مغرب کے لٹریری آرٹسٹس کی تقلید صرف ندرتِ خیال کے اعتبار سے کی مگر بیان کے لحاظ سے فارسی لٹریچر کا تتبع کرتے تھے کیونکہ ہماری زبان میں

فارسی لٹریچر کے اندازِ بیان ہی کھپ سکتے ہیں۔ جن حضرات نے انگریزی کی تقلید ادائے بیان میں بھی کی ہے انکے مضامین دیکھ لیجئے کہ غیر مانوس و اجنبی اجنبی سے لفظ آتے ہیں "خشخاش کے درختوں میں بلبل کا گانا" جی کو اتنا نہیں بھاتا جتنا "گل کے فراق میں بلبل کا نالۂ شبگیر" قیامت ڈھاتا ہے۔ میر صاحب سرائی کیفیتِ الفاظ سے ہمیشہ متنفر رہے۔ چھوٹے چھوٹے سیدھے سادے فقرے لکھتے تھے جو اپنے اچھوتے خیال اور نرالے طرزِ بیان کی وجہ سے دل میں نشتر بن کر اتر جاتے تھے۔ آجکل "ادبِ لطیف" کا غلط مفہوم اسدرجہ ذہن نشین ہو چکا ہے کہ اہمال سرائی کا دوسرا نام ادبِ لطیف رکھ دیا گیا ہے بیگانہ لب و لہجہ اختیار کرنے سے اپنی زبان پرائی ہوئی جا رہی ہے۔ یہ قصور ہے انگریزی تعلیم کے غلط اثر کا۔ ہمارے خیال و زبان دونوں پر اسکے ملمع کی اتنی گہری تہ چڑھ چکی ہے کہ ہمارے لب و لہجہ میں بھی بیگانگی پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارے دل میں اگر کوئی خیال آتا ہے تو اسکے اظہار کے لئے بہ نسبت اُردو کے انگریزی زیادہ آسان نظر آتی ہے اور بعض تو ایسے بگڑے دل ہندوستانی ہیں کہ انہیں غصہ بھی انگریزی میں آتا ہے اور خواب بھی دیکھتے ہیں تو انگریزی میں۔ اپنی زبان سے استقدر بُعد ہٹنے سے زیادہ رونے کا مقام ہے کہ قوم کے تنزل کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

مردوں سے زیادہ عورتوں کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے کیونکہ انکو اور زبانوں اور اور زبان بولنے والوں سے بہت کم واسطہ پڑتا ہے۔ مگر آج آپ دُور نہ جائیں خود اپنے ہی گھر میں دیکھ لیں کہ نئی پود اپنی زبان بولنا بھی عار سمجھتی ہے۔ بیگماتی زبان جس پر ہمیں ناز تھا بہت کچھ مٹ چکی اور جو باقی ہے بڑی بوڑھیوں کے ساتھ سسک رہی ہے۔ آج کسی بڑی بوڑھی کی زبان سے "اے اُوئی بی، نوج!" نکل جاتا ہے تو لڑکیوں کے لئے ہنسنے ہنسانے کا اچھا سامان فراہم ہو جاتا ہے۔ ہاں مردانہ بول چال اور کھڑی کھڑی بولی میں آجکل کی لڑکیاں لڑکوں سے بھی کئی قدم آگے نظر آئینگی۔ بدقسمتی سے جنہیں کچھ لکھنے لکھانے کا شوق ہے اُنکے مضامین دیکھ لیجئے کہ نظم میں تذکیر کا صیغہ کس دیدہ دلیری سے استعمال کرتی ہیں اور فلسفۂ محبت پر مفکرانہ شان سے بحث کر کے نسوانیت کا کس بیدردی سے خون بہاتی ہیں۔ گفتگو میں مردانہ لب و لہجہ آجکل فیشن کا ایک جُزو سمجھا جاتا ہے۔ قابلیتوں کا یہ حال ہے کہ "مرأة العروس" کی زبان بولنے کا تو ذکر ہی کیا اسکی زبان سمجھنے کے بھی لالے ہیں۔ مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید اور اُس نام نہاد ترقی یافتہ معاشرت کی نقالی کا اور کیا اثر ہو سکتا ہے؟ وہ معاشرت جس کے ہاتھوں یورپ خود نالاں ہے!

دہلی میں بہت کم گھرانے ایسے باقی رہ گئے ہیں جن میں صحتِ زبان کا اب بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اِنہی میں سے ایک گھر میر صاحب کا بھی ہے کہ غیر مانوس اور ٹکسال باہر لفظ بہت کم سُننے میں آتا ہے۔ میر صاحب وہی اُردو بولتے تھے جو لکھتے تھے۔ اُن کی تقریر و تحریر میں بہت کم فرق ہوتا تھا۔ جن حضرات

کو اُن سے گفت گو کا فخر حاصل ہوا ہے جانتے ہیں کہ فلسفیانہ نکتہ سنجیوں اور دلکش اندازِ بیان سے اُن کی معمولی باتیں بھی خالی نہ ہوتی تھیں۔ یہ شُستہ مذاقِ ادب اُن کے مزاج میں کچھ ایسا رچ گیا تھا کہ گھنٹوں اُن کی باتیں سُنتے پر بھی طبیعت سیر نہ ہوتی تھی، باتیں ایسے پتہ پتہ کی کہتے تھے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُسنے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسقدر تبحرِ علمی کے باوجود اپنے چھوٹوں کو مرعوب کرنے کی کوشش نہ کرتے تھے، چاپلوسی اور زمانہ سازی اُنہیں چھو نہیں گئی تھی۔ جو کچھ اُنہیں کہنا ہوتا تھا بے لاگ کہتے تھے۔ لگی لپٹی کسی کی نہ رکھتے تھے۔ میر صاحب کا یہ خاص کیریکٹر تھا کہ کسی کے غلط خیال کی صحت ٹھنڈے دل سے کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اُن کا طریقِ استدلال اسدرجہ اقرب الفہم ہوتا تھا کہ مانتے ہی بن پڑتی تھی۔ مگر غلط زبان کی اُنہیں کبھی سہار نہ ہوتی تھی۔ اس لئے اُن سے باتیں کرنے میں ایک ایک لفظ سوچ کر ادا کرنا پڑتا تھا کہ ذراسی لغزشِ زبان سے کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اسکی توضیح ایک دلچسپ واقعہ سے کروں:۔

ایک معقول ادیب دہلی تشریف لائے تو میر صاحب سے بھی ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اُنہیں اِس خیال سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اُنہیں بتایا کہ میر صاحب کے سامنے اچھے اچھے زبان داں بھی جاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ بھول چوک انسان کی فطرت میں داخل ہے مگر میر صاحب غلط زبان سے کبھی درگذر نہیں کرتے اور پھر جو اُنکے جی میں آتا ہے بے تکلّف سُناتے ہیں۔ اگر اسکے لئے تیار ہو تو چلو۔ اور اگر انکے کہے کا بُرا مانو تو تمہارا نہ جانا ہی بہتر ہے۔ میر صاحب سے ملکر بہت کم لوگ خوش ہوتے ہیں اور یہ اُن کی صاف گوئی ہی ہے جسکی وجہ سے اکثر حضرات اُنکو مغرور اور بہت سے کم عقل اُنہیں بد دماغ سمجھتے ہیں مگر جن لوگوں کو اُنکے مزاج میں درخور ہے جانتے ہیں کہ اُنکے اعتراضات کسقدر صدق دلی و نیک نیتی پر مبنی ہوتے ہیں، چنانچہ اِس قسم کا ایک مُستقل لکچر دیکر اُنہیں میر صاحب سے ملاقات کیلئے تیار کیا۔ میر صاحب ہر ملاقاتی سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے چنانچہ اِن سے بھی ملے اور اُن کی دلچسپ باتوں کا سمندر لہریں لینے لگا۔ میرے دوست بہت خوش تھے اور وقت بخیر و عافیت اس لئے گذرا کہ میر صاحب ہی بیشتر بولتے رہے۔ جب ہم چلنے کو ہوئے تو گیدڑ کی شامت کا وقت آ پہنچا اور وہ شہر کی طرف بھاگا یعنی میرے ادیب دوست نے رسمی طور پر معذرت کرتے ہوئے کہا "آپکا بہت قیمتی وقت ضائع ہوا۔ اب میں معافی مانگتا ہوں" بس پھر کیا تھا۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ میر صاحب نے گھُور کر اُن کی طرف دیکھا اور گرج کر کہا "معافی کیا مانگتے ہو۔ بھیک مانگو صاحبزادے۔ اور تم سے ہو گا بھی کیا" نہ معلوم میر صاحب نے اور کیا کیا صلواتیں سُنائی ہونگی، میں تو اپنے کھسیانے دوست کا ہاتھ پکڑ جلدی جلدی زینہ سے نیچے اُتر آیا مگر اُن کی آواز تھی کہ دُور تک ہمارے کانوں میں مُبہم گونج پیدا کرتی رہی۔

یہ واقعہ اس لئے بیان کیا گیا کہ آپ پر واضح ہو جائے میر صاحب کو صحتِ زبان کا کسقدر خیال رہتا تھا

میر صاحب نے بے شمار مضامین اپنی یادگار چھوڑے ہیں مگر ان کے کسی مضمون کے کسی فقرے میں بھی ترمیم کی گنجائش نہیں۔ مضامینِ نثر میں یہ بات بہت مشکل ہے کہ غیر ضروری الفاظ نہ آنے پائیں مگر میر صاحب کی نثر میں وہی خصوصیت ہے جو کلامِ اساتذہ میں عموماً اور کلامِ غالب میں خصوصاً پائی جاتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ غالب مرحوم ہی کے فیضانِ صحبت کا اثر ہو کیونکہ میر صاحب کو اُن سے اکثر دماغی سابقے رہ چکے تھے۔

میر صاحب کا کوئی ایک مضمون ایسا نہیں ہے جس سے انکی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت کا صحیح اندازہ ہوسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ بطور نمونہ وہ کُل تحریریں ہی پیش کی جاسکتی ہیں جو اُن کے قلم سے نکلی ہیں۔ میر صاحب اپنے مضمون کا موضوع خود ہی وضع کرتے تھے اور اس کا مواد خود اپنی ہی ذات سے فراہم کرتے تھے۔ مضامین میں تنوع اسقدر ہے کہ صرف میر صاحب کا ذہن ہی انکے عرصۂ خیال کو محیط کرسکتا تھا۔ ان کا سرمایۂ تخیل چند گنے بندھے واقعات و مشاہدات پر مشتمل نہیں تھا بلکہ ایک ایسا خزانہ تھا جو قلبِ انسانی کی طرح بسیط، فطرت کی طرح متلون اور رُوح کی طرح لامحدود تھا۔ اس لئے جس موضوع پر انہوں نے قلم اُٹھایا اسے دولتِ تخیل سے مالا مال کردیا۔ ہر نیا موضوع ان کے ذہن میں ایک ایسی قوت بیدار کردیتا تھا جو اُس سے پہلے کبھی صرف نہ ہوئی تھی۔ اِس لئے کسی ایک مضمون میں اُن کی جُملہ ذہنی قوتوں کو تلاش کرنا عبث ہوگا۔ ہر مضمون میں ایک نئی قوت کارفرما نظر آتی ہے جسکو محدود و مجتمع کرنا نُور کو مُقیّد اور نکہت کو پابستہ کرنے کے مُرادف ہوگا۔ یا پھر اس کی مثال اُس بیوقوف معمار کی سی ہوگی جو ایک اینٹ دکھاکر پوری عمارت کا نقشہ ذہن نشین کرانا چاہتا ہو۔ ہر انشا پرداز کے لئے دو راستے کُھلے ہوئے ہیں۔ یا تو نئے نئے خیالات سے ہماری معلومات میں اضافہ کرے اور ہمارے ذہن کو اُس نہج پر ڈالدے جو تخیلات نو سے بھرا پڑا ہے اور جسے ہم اپنے ذہن کی مدد سے معلوم نہیں کرسکتے تھے۔ یا دوسرا راستہ یہ ہے کہ اُسی کو جمع کرکے مُجسّم کردے جو ہمارے علم میں پہلے بھی تھا اور اِنہی تاثرات کو اور بھی اُجاگر کرکے اُستوار کردے جن کا وجود اس سے قبل ہمارے ذہن میں تھا۔ جو پہلے صرف واضح تھا اُسی کو واضح تر کردے اور اُسی کو جس سے ہم پہلے بھی کچھ واقف تھے اتنا اُبھار دے کہ اسپر جدّت کا دھوکہ ہونے لگے۔ یا یوں سمجھیئے کہ ایک جدید و مُنزّہ ہے اور دوسرا موثر و پُرزور۔ ایک انشا پرداز یا تو مُوجد بن سکتا ہے یا مُخترع۔ کمالِ فصاحت کے لئے ضروری ہے کہ کوئی نئی بات پیدا کی جائے خواہ بہ جدّت بہ لحاظِ خیال ہو یا بہ لحاظِ بیان۔ جدّت آفرینی اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ چیزیں روشنی میں کھینچ کر نہ لائی جائیں جو تاریکی میں پوشیدہ ہیں اور ان کی توضیح و تشریح اُس حد تک ضروری ہے جہانتک کہ کسی کے بس میں ہو یعنی شرح و بسط سے کام لینا انشا پرداز کا فرض ہے۔ اگر یہ نہیں تو فصاحت بھی معدوم سمجھیئے۔ ایسی فصاحت جس میں فلسفیانہ رنگ آمیزی ہو ادب میں وہی مرتبہ رکھتی ہے جو تاریکی و روشنی تصویر کشی میں کہ امتزاجِ سایہ و نُور ہی تصویر کی خوبی میں داخل ہے اور صاحبِ نظر تاریکی سے بھی اسی قدر لطف اندوز ہوتے ہیں جس قدر کہ روشنی سے۔

میر صاحب کے کمالات ادبی جانچنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ انہوں نے کونسا طریقہ اختیار کیا۔ اور اُس نے کس نوع کی اثر اندازی کی۔ میر صاحب مُوجد بھی تھے اور مخترع بھی کہ انہوں نے اُردو زبان میں جو نازک خیالیاں پیدا کی ہیں اُن کی مثال کسی اور زبان کے لٹریچر میں بھی بمشکل ملے گی۔ مغربی خیالات سے متاثر ہوکر اُنہوں نے جو مضامین لکھے ہیں اُنہیں اختراعات فائقہ سمجھئیے کہ جس خوبی سے انہوں نے کسی بات کو ادا کیا ہے وہ میر صاحب ہی کے لئے مخصوص تھی۔

اگر انکی تحریروں کا اثر اُس حد تک عامتہ الناس پر نہیں ہوا جس حدتک کہ اِس میں اور وں کو کامیابی ہوئی تو یہ کوئی عجزِ قوّت کی دلیل نہیں ہے بلکہ اُفتادِ طبیعت اسکی ذمہ دار ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے موضوع۔ انکے تخیّلات اور دلائل سطحی اور عامیانہ نہ تھے۔ اُنہوں نے مقبولیتِ عام کیلئے یہ وضع خاص اختیار نہیں کی تھی، بلکہ مقبولیت خاص کیلئے کہ دادِ سُخن شناس بہر حال تحسینِ ناشناس سے بہتر ہوتی ہے۔ جدّتِ خیال کا میدان بہت تنگ ہوچکا ہے۔ اساتذۂ قدیم سے کوئی بات نہیں چھوٹی۔ اس لئے جو کچھ اگلے لوگ کہہ گئے ہیں اُسی کا اعادہ عام طور سے کیا جاتا ہے۔ مگر اسکے لئے بھی ایک خاص سلیقہ کی ضرورت ہے جو میر صاحب کو بدرجۂ اتم حاصل تھا۔ گُل و بُلبُل۔ قیس و لیلیٰ۔ شیریں و فرہاد۔ زُلف و شانہ۔ عیش و غم۔ وہی پُرانی باتیں ہیں جنہیں ایک خاص انداز میں میر صاحب نے پیش کیا ہے۔

میر صاحب کا اسٹائیل مُروّجہ طرزوں سے قطعاً جُدا تھا۔ مُقفیٰ و مُسجّع عبارت ان کے مضامین میں دیکھنے میں نہیں آئی مُشکل الفاظ نہ وہ بولتے تھے اور نہ لکھتے تھے۔ کسی خیال کے اظہار کیلئے مناسب سے مناسب اور کم سے کم الفاظ استعمال کرنا اور اسکو ایسے پیرایہ میں ادا کرنا کہ اس سے بہتر ادائگی ممکن نہو میر صاحب کے اسٹائیل کی خصوصیت ہے۔ الفاظ چھانٹنے میں اُنہیں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ غیر مانوس الفاظ اور ایسے لفظ جن کی سند کلامِ اساتذہ سے پیش نہ کی جاسکتی ہو انہوں نے کبھی استعمال نہیں کئے۔ مُشکل سے مشکل خیال کو بھی سیدھے سادے اور سلیس جُملوں میں ادا کر دیتے تھے اور اِس سلاست کو قائم رکھنے کیلئے بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ انکے مضامین کے مسودے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیس الفاظ کی اُنہیں کسقدر تلاش رہتی تھی۔ نظرِ ثانی میں اُنہیں جب کوئی آسان لفظ مل جاتا تھا تو مشکل لفظ قلم زن کر دیتے تھے اور یہ آسان لفظ انگوٹھی میں نگینہ کی طرح موزوں نظر آتا تھا۔ انکے وسیع مطالعہ کا یہ اقتضاء تھا کہ مشکل الفاظ ان کی زبانِ قلم سے نکل جائیں مگر اُن کی اثر آفرینی اور نفاست پسندی سلاست کی مُقتضی تھی۔ فلسفے کی گتھیوں کو باتوں باتوں میں سُلجھا دیتے تھے اور یہی حال اُن کی تحریر کا بھی تھا کہ فلسفیانہ مسائل کو سلیس اور عام فہم طریقہ میں بیان کرتے تھے،

مناظرِ قدرت کی تصویر الفاظ میں کھینچنا کچھ دشوار امر نہیں۔ لیکن خصائلِ انسانی کو الفاظ کا جامہ اِس طرح پہنانا کہ دل میں کھُب کر رہ جائے مُشکل ہے۔ مُشکل اس لئے ہی کہ اِس میں مشاہدہ سے زیادہ تجربہ کی

ضرورت ہے۔ میر صاحب کو خصلت نگاری میں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ فطرتِ انسانی پر عموماً اور فطرت نسوانی پر خصوصاً جتنی گہری نظر میر صاحب کی پڑتی تھی شاید ہی کسی اور کی پڑی ہو۔ اُن کی نگاہیں سطح سے ٹکرا کر لوٹ نہیں آتی تھیں بلکہ رانجن شعاعوں (X-RAYS) کی طرح جسم میں سے گذر کر دل کے تاریک سے تاریک گوشے میں بھی پہونچ جاتی تھیں۔ میر صاحب کے مضامین میں رموزِ خصلت کی اکثر قلمی تصویریں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک یہی فقرہ دیکھئے۔

عورت جب منہ پھیر کر چلنے کے لئے کھڑی ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوڑ کر دامن پکڑے"

یہ وہ فلسفہ ہے جو آپکو کتابوں میں نہیں ملیگا اور نہ مشاہدہ آپکو سکھا سکتا۔ اس کے لئے تجربہ کی ضرورت ہے کیونکہ یہ فلسفہ ناز و نیاز ہے جو علم سے نہیں سمجھا جاتا، بلکہ عمل سے۔ یہ صُغرا و کُبرا کی قیود سے آزاد ہے کیونکہ عورت کی فطرت کو سمجھنا منطقی کے بس کی بات نہیں۔ اسکو سمجھنے کے لئے ایک عمر کا تجربہ چاہیئے۔ اور عورت کی خصلت کا یہ وہ پہلو ہے جسکو میر صاحب نے خوب سمجھا اور خوب لکھا ہے۔ اس قسم کے ایک دو نہیں سینکڑوں جواہر پارے میر صاحب کے لٹریچر میں موجود ہیں، میر صاحب اگر یورپ میں پیدا ہوئے ہوتے تو اس نوع کے فقروں سے (Aphorisms) کی متعدد جیبی کتابیں شائع ہوتیں۔ افسوس آج اُن کے قیمتی لٹریچر کے قدردان بھی مشکل سے ملینگے۔ میر صاحب کا انتقال ایسے بے وقت ہوا کہ انکے ہم عمر و ہم عصر اُن سے بہت پہلے اُٹھ چکے۔ گنتی کے دو ایک بزرگ جو زمانہ کی دست برد سے بچ رہے ہیں اس لائق نہیں رہے کہ میر صاحب کے لٹریچر پر کما حقہ اظہارِ خیال کرسکیں۔

ایم مہدی حسن (افادی الاقتصادی) اگر زندہ ہوتے تو میر صاحب کو اپنے کمالاتِ ادبی کی کچھ داد ملتی۔ ادبی قدرشناسی مرحوم پر ختم تھی کہ اُن کی تمثیل نکتہ سنجی و جُزرسی کا اعتراف علامہ شبلی جیسے متبحر نقاد نے بدیں الفاظ کیا ہے "کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرہ بھی لکھنے نصیب ہوتے"۔ آج سے پورے ۲٦ سال پہلے میر صاحب کے بارے میں انہوں نے جو کچھ کہا تھا اسکو ۔

خوشتر آں باشد کے سرِ دلبراں   گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

...... کے مصداق "صلائے عام" کے ابتدائی پرچوں میں سے نقل کرتا ہوں۔ یہ داد خاصہ ہے جو اس سے بہتر الفاظ میں ممکن نہیں:-

"...... میرا موضوعِ سُخن "ناصر علی کا اُردو لٹریچر" ہے جن کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی کی نسبت مجھے اصرار ہے کہ ملک کی انشا پردازی میں امتیازِ خاص رکھتی ہے اور ظلم ہے اگر اُردو کے آشنائے ازلی کے کمالات کی داد نہ دی جائے جس کا فیاضانہ اعتراف خود لٹریچر کے فرائض میں سے ہے"

"دائرۂ ادبیہ" (کھُلی چِٹھی) میں ایم۔ مہدی حسن لکھتے ہیں:۔

"...... پرچے دیکھے۔ مُدت کی چوٹ جو دل کا چور بنی ہوئی تھی اُبھر آئی۔ میں آپ کے لٹریچر کا اُس وقت سے دلدادہ ہوں جب لٹریچر کا صحیح مفہوم بھی میرے ذہن میں نہیں تھا، کم و بیش بیس برس ہوئے (یہ مضمون ۱۹۰۹ء میں چھپا تھا) جب آپ نے ایک وضع خاص پر لکھنے پڑھنے کا شغلہ جاری کیا۔ یعنی "تیرہویں صدی" میں دادِ سخن دی "تہذیب الاخلاق" کے ساتھ ساتھ آپ نے جس ٹھاٹھ سے دہواں دھار مضامین لکھے اور سرسید کے لٹریچر پر جس سلیقے اور سخن گسترانہ شوخیوں سے آپ نے انتقادات کی ٹہرائی سچ یہ ہے کہ وہ اُردو لٹریچر کی جان ہیں...... میں کھُل کر کہتا ہوں کہ آپ نے اُس وقت انشا پردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھوں میں نہیں لئے تھے۔ آپ کا ادبی مذاق اور ایک خاص طرح کا مادۂ اختراعی (اور یجنیلٹی) دراصل آپکے اوّلیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ ......"تیرہویں صدی" میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں آپ کا عنصر غیر فانی ہے۔ لیکن افسوس ہے آپ کو یہ خیال نہ آیا کہ جس سے پچھلے دنوں اتنے دماغی سابقے رہے وہ بہیئتِ مجموعی کتابی صورت میں جلوہ گری کا حق رکھتی۔ اِس پاکیزہ مجموعہ کی ترتیب سے اُردو ادبِ عالیہ (کلاسکیس) میں آپ کی طرف سے مستقلاً ایک قیمتی اضافہ ہوتا جو یادگار زمانہ رہتا، آپ معاف فرمائینگے، یہ بدترین حق تلفی تھی جو آپ اپنی کر سکتے تھے، یہ خیال قطعاً صحیح نہیں کہ مُلک میں اچھے لکھنے والے پیدا ہوگئے ہیں، نئی نسل کو آپ کی اُردو سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ نہ بہیئتِ موجودہ کسی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ آئندہ کچھ کر سکے۔ صاف بات ہے، جس لٹریچر پر آپ مٹے ہوئے ہیں سرے سے اسکی جان کے لالے ہیں جس زبان کی حیاتِ طبعی بوڑھے نذیر احمد، اور حالی اور شبلی کے دم تک ہو وہ سسک سسک کر کب تک چل سکتی ہے؟...... آپ کی زبان اپنے مختص النوع صفات کے ساتھ کسی اور کے بس کی چیز نہیں اور سچ یہ ہے کہ آپ اپنے فن کے اختصاصی (اسپشلسٹ) ہیں۔

میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافتِ خیال پاتا ہوں۔ آپکی چشمِ سخن جہاں "جنسِ لطیف" اور اُس کے متعلقات کی طرف اشارے کرتی ہے وہ نزاکتِ خیال کی آخری حد ہے "تیرہویں صدی" میں بہتیرے نشتر ہیں جو آج تک دل میں چبھ رہے ہیں۔ ابھی ابھی ایک فقرہ نظر سے گذرا:۔

"یہ پان اُن کے لئے ہے"

بے اختیار جی بھر آیا۔ اگلے پچھلے قصّے پیشِ نظر ہو گئے۔ پوچھیئے تو بتا نہیں سکتا۔ لیکن کچھ تو ہے جو دل پر چوٹ لگی۔ رکھ رکھاؤ اتنا تو ہو۔ ایک چھوٹا سا فقرہ اور عطرِ زندگی!"
اِس سے بہتر میر صاحب کے دل و دماغ کے نتائج کی داد کسی نے نہیں دی۔ اور نہ دے سکتا ہے۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

"...... سچ یہ ہے پاکیزہ لٹریچر کائنات کے خوبصورت مناظر کی طرح اِنسان کے اخلاقی اور غیر مادّی جذبات کو اُبھارتا ہے۔ آپ اِسے خوب سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی ادبی نزاکتیں مُلک میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ لٹریچر بجائے خود ایک فلسفہ ہے۔ اکثر لوگ نہیں جانتے ورنہ ہماری زبان میں جو سیلابِ خود رو بڑھ رہا ہے اور جس کا بیشتر حصّہ پڑھنے پڑھانے کے لائق نہیں ہوتا کھوٹے سِکّے کی طرح قطعاً نظر انداز کرنے کے لائق تھا۔ مُلک میں سنجیدہ موضوع پر ایک آدھ لکھنے والے موجود ہیں لیکن "روزمرہ" کو فلسفہ سے روشناس کرنا آپ اور صرف آپ کا حصّہ تھا۔ آپ کی شستہ رُفتہ زبان میں فلسفیانہ رنگ اس طرح جھلکتا ہے جیسے کسی نازنین کی سُفید جلد کی تہ میں اُودی اُودی رگیں۔ جنکے پیچ و خم کی دیکھ بھال اس سن و سال میں بھی آپ کے دائرۂ نظر سے کچھ دُور نہیں! یہ حالت کسقدر لائقِ رشک ہے......"

ایم مہدی حسن میر صاحب کے اسدرجہ معتقد تھے کہ ان کے ادبی مضامین میں میر صاحب کا رنگِ خاص جھلکتا ہے، اور اکثر فقروں پر میر صاحب کی تحریر کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی کی طبیعت کا صحیح اندازہ لگانا چاہیں تو اس کے خطوں سے لگا سکتے ہیں کیونکہ خط یہ سمجھکر نہیں لکھے جاتے کہ پبلک بھی انہیں دیکھیگی، مکتوب کا بیساختہ پن ہی فطرتِ کاتب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایم مہدی حسن کا اسٹائل ان کے مضامین سے زیادہ ان کے خطوں میں لُطف دکھاتا ہے کہ ان میں بلا تصنّع اُنہوں نے جو کچھ لکھا اِس سے ان کے جوہرِ اصلی کی نمائش ہوتی ہے۔ صلائے عام" دیکھکر جس بے تکلّف رائے کا انہوں نے ذیل کے مکتوب میں اظہار کیا ہے اِسے دادِ خاصہ اور روحِ تنقید سمجھیئے:۔

"...... پاکیزگیِ لٹریچر کے ساتھ صنعت گری یعنی آرٹ کا اچھا خاصا مُرقّع ہے جو یہاں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اکثر جگہ آپ کی نزاکتِ خیال میری آنکھوں سے آنسو بنکر ٹپکی لیکن دل کا درد نہ گیا۔ خدا جانے کیا بات ہے؟ آپ کی تحریر سے دل کو چوٹ لگتی ہے جیسے مجھ پر گزری ہوئی کوئی بپتہ بپتہ کی کہہ رہا ہو۔ آپ لکھتے نہیں، دونوں ہاتھوں سے کلیجہ نکالتے ہیں...... جتنے مضامین خاص تھے ایک ایک کو یاد نہیں کے دفعہ پڑھا اور اب بھی یہ وظیفہ جاری رہیگا...... جس طرح چھُری گلے مِلکر تڑپ کو بڑھا دیتی ہے، میں دیکھتا ہوں آپکی تحریر آشناؤں کو مِلکر مارتی ہے۔ آپ کے قلم میں زبان کی جگہ چاقو۔ خنجر۔ تلوار، کٹار سبھی

کچھ تو ہے۔ خدا ہی ہے جو جان بچے"
اِس سے بہتر نکتہ سنجی ممکن نہیں۔ "صلائے عام" کی خوبیاں بیان کرنے کیلئے تہذیب کی زبان کوئی کہاں سے لائے؟ افسوس بقول میر صاحب مرحوم "اِس شخص کو زمانے کی نظر کھا گئی"! اور یہی وہ شخص تھا جس نے میر صاحب کے لٹریچر کی صحیح قدردانی کی اور ایک حد تک ان کی وضع خاص پر قلم بھی اُٹھایا ورنہ میر صاحب کا اسٹائیل صرف انہی کے لئے مخصوص تھا جسے وہ ازل سے اپنے ساتھ لائے تھے اور غالباً ابد تک دو سطریں بھی اس اندازِ بیان میں کوئی نہ لکھ سکیگا۔

میر صاحب کے مضامین کے بارے میں مَیں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اُن کا ہر مضمون اُردو لٹریچر میں ایک خاصہ کی چیز ہے۔ انہوں نے ہر موضوع پر لکھکر اپنا کمالِ اِنشا پردازی دِکھایا ہے۔ مذہب۔ تاریخ۔ ادب اور فلسفہ پر اُن کے اکثر مضامین یادگار رہینگے۔ اُنہوں نے اپنے خاص طریقِ فکر سے جہاں ادب و انشا میں نئی نئی باتیں پیدا کیں وہاں طرزِ خاص کے چند مُستقل عُنوان اپنے لئے مقرر کر لئے تھے۔ اُن میں سے میں صرف دو کا ذکر یہاں کرنا چاہتا ہوں۔ ایک "مضمونِ پریشاں" اور دوسرا "محشرِ خیال" یہ دونوں عُنوان اپنے ناموں کی لحاظ سے ایک دوسرے سے جُدا نظر آتے تھے مگر موضوع و طرزِ بیان کے اعتبار سے ایک ہی نوع کے مضامین ہوتے تھے۔ دونوں میں مُتعدد و متنوّع خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یا اِسے یوں سمجھیئے کہ روح ایک ہی تھی مگر قالب دو تھے۔ کبھی ایک میں ڈھل جاتی تھی اور کبھی دوسرے میں۔ ان مضامین کی نوعیت یہ ہے کہ ان میں میر صاحب نے غالب کے اِس مصرعہ کا ثبوت دیا ہے "ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال"۔ یا انگریزی (Stray thoughts & musings without method) کی تتبّع میں اِنہیں "مجموعۂ خیالاتِ پریشاں" سمجھیئے۔ مضمونِ پریشان کی وضاحت خود میر صاحب نے کر دی ہے۔ اِسے "محشرِ خیال" کی توضیح بھی سمجھ لیجئے:۔

"مضمونِ پریشان کو میں زُلفِ حسیناں سے تشبیہ دیتے دیتے تھک گیا۔ ٹکڑے ٹکڑے مضمون جو فقیروں کی گدڑی کی طرح الگ الگ ہوں کیا آشفتہ مزاجوں کے دامن و گریباں کے پُرزوں سے مُشابہ نہیں ہو سکتے جو فصلِ گل میں شوق سے اُڑائے جاتے ہیں؟ یا اُس خطِ شوق سے نہیں مِلتے جسے یار ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دے؟ اِس مضمون کو اُس ہار سے کیوں نہ تشبیہ دی جائے جو رات کو یار کے گلے سے ٹوٹ گیا، جس کے موتی صبح کو سیج پر بکھرے مِلے؟ یہ بھی جانے دیجئے۔ اِس طرح کیوں نہ کہیئے۔ ع
کسی کے مُنہ سے جھڑیں پھول باتیں کرنے میں
اور اگر آپ کو زُلفِ حسیناں ہی سے تشبیہ زیادہ پسند ہے تو مضمونِ پریشاں کو گیسوئے جاناں میں دِلِ صد چاک کا شانہ سمجھیئے ؎

یوں لائے وال سے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈ کر ✤ دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اُٹھا لیا

بکھرے موتی ڈورے میں نہیں تو پوٹلی میں باندھ کر ایک جگہ رکھ دئے ہیں کہ کھوئے نہ جائیں
یہ تشبیہ پسند نہ ہو تو مضمون پریشاں کو غالب کے اِس شعر کی شرح سمجھیئے ؎

نالہ پابندِ نے نہیں ہے   فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

لٹریری خوبی کے اعتبار سے "مضمونِ پریشاں" شاعرانہ نثر کا اعلیٰ نمونہ ہوتا تھا، اور شاعری بھی وہ جس میں فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔ میر صاحب تشبیہ و استعارہ کے بادشاہ تھے۔ "مضمونِ پریشاں" میں اُن کا یہ وصف معراجِ کمال پر نظر آتا ہے۔ ایک نقادِ سخن نے "مضمونِ پریشاں" کی نسبت بہت خوب لکھا:۔

"اِس طرز کی مثال یہ ہے کہ جیسے کوئی حسین سر کے بال کھولے چراغِ مرقد جلا رہا ہے"۔

میر صاحب نے جہاں فلسفیانہ سنجیدگی سے ہر موضوع پر قلم اُٹھایا ہے وہاں ان کے اکثر مضامین میں مزاح وطنز کا ہلکا ہلکا رنگ کچھ اور ہی لطف دکھاتا ہے۔ "تیرہویں صدی" کے بعد اور "صلائے عام" سے پہلے میر صاحب نے ایک اور پرچہ "ناصری" کے نام سے جاری کیا تھا۔ اِس پرچہ کی خصوصیتِ امتیازی ہی یہ تھی کہ مشکل سے مشکل موضوع پر بھی جو مضمون لکھے گئے اُن میں بھی مزاحِ لطیف کی چاشنی ہوتی تھی۔ ظرافت کا مفہوم یہی نہیں ہے کہ کسی فقرے پر آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں یا ایسے قہقہے لگائیں کہ پڑوسیوں کو آپکی صحتِ دماغ میں شُبہ ہونے لگے بلکہ درحقیقت ظرافت کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ دل میں رہ رہ کر ہلکی ہلکی سی گدگدی ہوتی رہے جس سے نہ صرف لب آشنائے خندہ ہوں بلکہ انبساطِ روح بھی حاصل ہو۔ میر صاحب کا ہیومر اسقدر سطحی نہیں ہوتا تھا کہ پہلی ہی نظر میں آپ بے اختیار ہنس پڑیں۔ اُن کی ظرافت عامیانہ اور مُبتذل نہیں تھی کہ دیکھتے ہی ہنسی آجائے بلکہ اتنی گہری اور مُنزّہ کہ بغیر تعمقِ نظر اس سے لُطف اُٹھانا ممکن نہیں۔ خوش مذاقی اتنی ہی بھلی معلوم ہوتی ہے جتنا کہ آٹے میں نمک۔ نمک میں آٹا کھپنا مُشکل ہے۔ میر صاحب نے شمائلِ نفسی کا تجزیہ خوب کیا ہے اور اس میں جہاں کہیں ان کے قلم نے اپنی شوخی دِکھائی ہے اُسے لائیٹ لٹریچر کی روح سمجھیئے کہ بار بار پڑھنے پر بھی اُس کی لطافت میں کمی نہیں آتی۔ یہ ان کی ودیعتِ خاص تھی کہ مابعدالطبیعات کے خُشک مسائل اور خصلتِ انسانی جیسی اُلجھی ہوئی گتھیوں کو ہنستے ہنساتے سُلجھا دیتے تھے۔ نازک خیالی و پاکیزہ بیانی، یہ دونوں صفتیں انکے مذاقِ ادب میں ایسی رچ گئی تھیں کہ ظریفانہ فقروں میں بھی ہاتھ سے جانے نہیں پاتی تھیں۔ بڑھاپے اور جوانی کا موازنہ آپ نے نظم و نثر میں اکثر دیکھا ہو گا مگر میر صاحب نے اسے جس رنگ میں پیش کیا ہے وہ نزاکتِ خیال و نفاستِ بیان کے علاوہ ظرافت کا اچھوتا پیرایہ بھی ہے۔

"قیس کو بیاباں میں اور فرہاد کو بیستوں پر وہ تنہائی نہ تھی جو بُوڑھے کو بھرے گھر میں ہوتی ہے کہ وہاں ہر وقت خیالِ یار ساتھ تھا اور یہاں ہر شخص کو بُوڑھے کے خیال سے بیگانگی ہے۔ جوانی میں خود بخود آپ کی طرف نگاہیں اُٹھ جاتی تھیں، اب کہنے سے بھی کوئی

مُڑ کر نہیں دیکھتا۔ آگے نیم نگاہی جو کام کر جاتی تھی اب عینک لگانے سے بھی وہ بات میسّر نہیں۔
جوانی سے جس عورت کا ساتھ رہا اب گلے کا ہار دِکھائی دیتی ہے۔ بالوں میں خضاب لگایا تو
سب سے پہلے اُسی نیک بخت نے جان لیا جس کی نگاہ میں جوان ہونا منظور تھا۔ ہونٹ کیا
چبائیں کہ دانت رُخصت ہو چکے۔"
بے بسی کی کیسی عبرت انگیز تصویر ہے کہ بیک وقت ہمدردی و تبسّم دونوں چاہتی ہے۔
میر صاحب نے دُنیا اور اہلِ دُنیا کی کمزوریوں کو بہت غور سے دیکھا ہے مگر اِنہوں نے کبھی اُن کی ہنسی
نہیں اُڑائی اور نہ اپنے لٹریچر میں دُنیا سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ اسکے برخلاف اُن کے مضامین رجائیت
(Optimism) سے بھرے ہوئے ہیں۔ "زندگی" کے بارے میں اُنہوں نے اپنے اکثر مضامین میں
اظہارِ خیال کیا ہے مگر مُتشائم جذبات اُن کے مضامین میں نہیں دیکھے گئے۔ اس کے ثبوت میں مُتعدد اقتباسات
پیش کئے جا سکتے مگر اختصار کے خیال سے ذیل کی چند سطور نقل کی جاتی ہیں:-

"اِنسان نے گردشِ لیل و نہار سے اگر کچھ نہ سیکھا تو اپنی زندگی رائیگاں جانے دی۔ دُنیا
کو میں بہت اچھا جانتا ہوں کہ مجھے اس میں نیکی ہی نیکی نظر آتی ہے۔ بدی اگر ہے بھی تو چُھپی
چُھپائی اور یہی وجہ ہے کہ اِنسان عیب چُھپایا کرتا ہے۔ خدا کو دُنیا سے محبّت ہے جس طرح
ماں باپ کو اولاد سے ہوتی ہے اور اہلِ سُخن کو اپنے طبع زاد سے۔ اس میں عیب ہوں تو ہونے
دیجئے۔ حسینوں سے محبّت کے لئے یہ شرط نہیں کہ وہ وفا کریں۔ اُن کی بیوفائی پر بھی چاہنے
کا لُطف ہے۔ خدا نے عورت کو ناقص العقل بنایا ہے مگر نقص ہی رعایت چاہتا ہے خُمِ شکستہ
پیرِ مُغاں کو احتیاط سے اُٹھاتے دیکھا ؎

بادہ خواروں کیلئے یہ گردشِ افلاک ہی   مہر و مہ ساغر ہیں اور یہ چرخِ گردان چاک ہی"

رنگین شیشہ میں سے دیکھئے تو جس رنگ کا شیشہ ہوگا ہر چیز اُسی رنگ کی نظر آئیگی۔ یرقانی کو ہر چیز
زرد نظر آتی ہے۔ اِسی طرح شیشۂ خیال کا جو رنگ ہوگا ویسی ہی دُنیا آپکو نظر آئیگی:-

"گُلاب کے پُھول کو آپ خوردبین میں سے دیکھنے بیٹھئے تو جو پتّی حُسن و خوبی میں لبِ یار سے زیادہ
نازک نظر آتی تھی، خوردبین سے ہاتھی کے کان اور ٹوٹے چھاج کے برابر دکھائی دیگی، وہ ہلکی
سُرخی گندے پانی سے زیادہ کریہ معلوم ہوگی، پتیوں کی نرمی پُرانے الگیخت سے زیادہ
اور چمڑے سے بدتر نظر آئیگی۔ کسی پریوش کے خط و خال کو آپ آتشی شیشہ سے دیکھئے
تو ساری خوبی کا خون ہو جائیگا۔ اِسی طرح زندگی کو آپ ذلّت کی نگاہ سے دیکھئے تو بُری
معلوم ہوگی۔"

زندگی کا دار و مدار خیالِ رنج و خوشی پر ہے۔ مثل مشہور ہے کہ اِنسان اپنی قسمت کا آپ معمار ہوتا ہے۔

اسی طرح اپنی زندگی کو اچھا یا بُرا بنانا اپنے بس کی بات ہے۔ صائب نظمِ فارسی میں تشبیہ و استعارہ کا بادشاہ تسلیم کیا گیا۔ میر صاحب نثر اُردو میں صائب سے ہیٹے نظر نہیں آتے۔ زندگی کو خواب سے بہت مشابہت ہے اور شعراء میں یہ تشبیہ عام ہے، بلکہ زندگی ہی کو خواب تصوّر کیا گیا ہے' ع "ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں" میر صاحب کی نثر سے جہاں شاعری کی کوئی خصوصیت بچنے نہیں پائی وہاں زندگی اور خواب کی تشبیہ کیسے رہجاتی؟ فرماتے ہیں:-

"زندگی کو خواب سے تشبیہ دیتے ہیں مگر معمولی خواب سے اِس خواب میں فرق ہے کہ یہ خواب دوبارہ نہیں دکھائی دیتا۔ لیکن جس طرح خواب کا مدار خیال پر ہے کہ اکثر جس خیال میں آنکھ لگ جائے وہی خواب میں نظر آتا ہے۔ اگر خیال خوش ہے تو خواب خوش نظر آئیگا۔ ملال ہے تو خوف کے اسباب دکھائی دینگے۔ یہی حال اِس زندگی کا سمجھئے کہ جس خیال میں بسر کیجئے وہی پیش آتی ہے"

مابعد الطبیعات مسئلۂ حیات و ممات کے بارے میں کچھ ہی کہے۔ آپ یہ دیکھئے کہ میر صاحب نے کس خوبصورتی سے اِس کی توضیح کی ہے:-

"خالق نے جمعیتِ عالم کا مدار پریشانیوں پر رکھا ہے کہ شروع میں اجزائے عالم پریشان تھے۔ حکمِ ایزدی سے مجتمع ہوئے۔ جو جس سے ملنے کے لائق نہ ال گیا اب پھر وہی اجزاء پریشان ہو رہے ہیں جس کو ہم موت اور زندگی سمجھتے ہیں"

ایک شاعرانہ تصریح بھی دیکھ لیجئے جو نازک خیالی کی بہترین مثال ہے:-

"موت اور زندگی کی تشبیہ کسی کے بالوں کے کندھوں پر بکھر جانے کا اور پھر کچھ سمجھ کر جُوڑا باندھ لینے کا نام ہے"

غرض اِس قسم کی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ میر صاحب کسی گھر بند نہیں تھے ؎

شراب ناب ہی ہر رنگ کی اپنے پیالے میں   وہ طرہ کونسا ہو گُل میں کیا ہو شاخ لالے میں

میں دیکھتا ہوں کہ میر صاحب کا ذکر چھیڑنے کے بعد ختم کرنا مشکل نظر آتا ہے کہ خیالِ یار کی طرح دلکش اور زُلفِ یار کی طرح دراز ہے۔ اتنا لکھنے پر بھی اُن کے کمالات ادبی تشنۂ داد ہیں۔ میر صاحب کے پوتے جناب انصار ناصری بی۔ اے۔ اپنے جدِ امجد کی یادگار میں "ناصر نمبر" نکال رہے ہیں۔ مجھ سے ان کا اصرار تھا کہ میں بھی مرحوم سے متعلق کچھ لکھوں مگر امرِ واقعی یہ ہے کہ میر صاحب کا لٹریچر ایسا نہیں ہے کہ مجھ جیسا ہیچمداں اسکی خوبیاں سمجھ بھی سکے۔ خوبیوں کی وضاحت تو بڑی بات ہے ـــــ سُورج کو چراغ ہے دکھانا۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے اُس حسنِ اعتقاد کی بناء پر لکھا ہے جو مجھے مرحوم کی ذات سے تھا اور اُن کے لٹریچر سے ہے۔ یوں بھی میر صاحب

مرحوم میرے معنوی اُستاد تھے کہ ادب کا چسکا مجھے انہی کی تحریر و تقریر سے لگا اور ساقی فی الحقیقت "صلائے عام" کے آوازۂ ادب کی مضمحل صدائے بازگشت ہے۔ مجھے تو اُن کا ہر مضمون بے عیب نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ میری نظر کا قصور ہو۔ کہ مشہور ہے بے عیب ذات تو صرف اللہ کی ہے۔ مگر میں نے یہ بھی نہیں دیکھا اور نہ سُنا کہ کسی نے میر صاحب کے مضامین پر کبھی اعتراضات کئے ہوں۔ مہدی حسن مرحوم نے البتہ ایک دفعہ شکایت کی تھی اور اُس کے ساتھ خود ہی اس کا سبب بھی بنا دیا تھا:-

"........ خیالات میں ایک طرح کی بے نمکی پائی جاتی ہے اور وہ بات نہیں رہی جو کچھ پہلے تھی۔ شاید اس لئے کہ "تہذیب الاخلاق" کی طرح کوئی چیز اُلجھاؤ پیدا کرنے والی نہیں رہی، یعنی جذبات کے اُکسانے کا سامان نہیں رہا"

یہ شکایت میر صاحب سے اُس وقت کی گئی تھی جب کہ اُن کی عمر باسٹھ (۶۲) برس کی تھی اور ؎

رسم است کہ مالکانِ تحریر آزاد کُنند بندۂ پیر

دُنیا جہان کا یہی دستور چلا آتا ہے کہ سنِ رسیدہ لوگوں کو عُزلت گُزینی ہی اختیار کرتے دیکھا جوانی کا جامۂ تنگ جب کہولت کی جُھرّیوں سے چُنا جاتا ہے تو عروسِ سُخن سے زیادہ واسطہ رکھنے کی ہمّت کم دیکھی ؎

کہتے ہو آج تو سُرخی نہ رہے اشکوں میں نہیں یہ تو پوچھو کہ لہو کا بھی ہے قطرہ دل میں

سدا ایک سی کسی کی نہیں رہتی۔ خود میر صاحب نے اِس کا اقرار کیا ہے مگر ایک نئے انداز میں:-

"مجھے اقرار ہے کہ میری عمر کے ساتھ میری طبیعت کا رنگ بدل گیا..................
.... یعنی کچّا رنگ پختہ ہو گیا ؎

کہہ دیا بس کہ تری آہ میں تاثیر نہیں یہ نہ دیکھا کہ یہ سینہ میں ہے روزن کیسا؟

افسوس مہدی حسن مرحوم زیادہ عرصے نہیں جیئے ورنہ میر صاحب کا وہ لٹریچر دیکھکر جو انہوں نے اپنی آخری عمر میں چھوڑا ہے اُنہیں اپنی رائے بدلنی پڑتی کیونکہ مہدی مرحوم نے سُنا تھا کہ بڑھاپے میں لٹریچر جوان ہوتا ہے اور اسکی صداقت بچشمِ خود میر صاحب کے مضامین میں جھلکتی دیکھ لیتے۔

میر صاحب مشاہیرِ ادب کے طبقۂ اولیٰ میں تھے۔ ان کی وفات سے اُردو زبان کو ناقابلِ تلافی صدمہ پہونچا۔ کہا جاتا ہے کہ کائنات کے پردۂ خفا میں ہر چیز منتظر رہے ایسے شخص کی آمد کی جو اُسے روشناسِ عالم کرے چنانچہ نثرِ اُردو کا ہاتھ پکڑ کر جس نے آگے بڑھایا وہ خان بہادر میر ناصر علی مرحوم ہی تھے جن کے مرنے سے اُسکا سُہاگ اُجڑ گیا۔ اگرچہ اُن کی عمر نوے برس کے لگ بھگ تھی اور اس زمانہ کی عمروں کو دیکھا جائے تو مرحوم نے زیادہ عمر پائی لیکن اُن کی وفات کا افسوس اس لئے زیادہ ہے کہ جو جگہ ان کے اُٹھ جانے سے خالی ہوئی ہے اُسکو پُر کرنے والا کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آتا۔ افسوس ! ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے خداوندِ طبع لوگ افسوس تمکو میر سے صحبت نہیں رہی

اختتامِ مضمون پر میر صاحب کے لٹریری کریئر کی ایک اہم خصوصیت اور بیان کرنی چاہتا ہوں، وہ یہ کہ میر صاحب نے اپنی ساری عمر میں کبھی کوئی شعر نہیں کہا مگر شعر و شاعری کے باب میں بھی اُن کی سی واقفیت کے لوگ کم پیدا ہوئے۔ وہ خود شاعر نہیں تھے مگر اُنہوں نے دل و دماغ ایک شاعر کا پایا تھا اُن کی نثر میں وہی لُطف آتا ہے جو کہ نظم میں بلکہ اِس سے بھی زیادہ کہ عروض و قوافی کی قید سے نثر آزاد ہے اور اظہارِ خیال میں پابندیاں رُکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔ میر صاحب کی تحریر کی یہ خوبی ہے کہ اس میں نظم و نثر کا فرق اُٹھ جاتا ہے، یا یوں کہیئے کہ ایک ایسا سنگم ہے جس میں نظم کی گنگا اور نثر کی جمنا گلے مِل رہی ہیں اور اس طرح جو گنگا جمنی کیفیت پیدا ہوتی ہے اُس کا لُطف نہ تو تنہا نظم سے پیدا ہوتا اور نہ صرف نثر سے بلکہ اِن دونوں کے سنجوگ ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ پھر یہ لُطف یوں اور بھی دو بالا ہو جاتا ہے کہ نفسِ مضمون میں برجستہ سے برجستہ اور برمحل سے برمحل شعر دیکھ لیجئے جو انگوٹھی میں سجیلے نگ یا عروسِ خیال کی حسین جبیں پر جھمکتے جھومر سے کم نہیں۔

میر صاحب نے بلا کا حافظہ پایا تھا کہ ہزاروں شعر اُن کی نوکِ زبان تھے اور شعر بھی ایسے پاکیزہ و مؤثر کہ روح پھڑک پھڑک جائے۔ یہ وصف صرف اُنہی میں دیکھا کہ جس مضمون کا شعر چاہتے تھے فوراً انکی زبان پر آجاتا تھا۔ اُن کی باتوں میں یوُں او رہی جی لگتا تھا کہ ایک سے ایک نیا شعر سُننے میں آتا تھا۔ سُخن فہمی مرحوم پر ختم تھی۔ برجستگی اشعار اسکی گواہ ہے۔ اُن کا کوئی سا مضمون اُٹھا کر دیکھ لیجئے کہ موزونیت کے اعتبار سے جتنا اچھا مصرف کسی شعر کا آپ اس میں دیکھینگے کسی اور انشا پرداز کی تحریر میں نظر نہ آئیگا۔ میر صاحب کی مضمون نگاری کا عرصہ کم و بیش پینسٹھ سال پر محیط ہے مگر بہ استثنائے چند کوئی شعر ایک سے زیادہ دفعہ ان کے مضامین میں نہیں دیکھا گیا۔ یہ ثبوت ہے اُن کی غیر معمولی ذہانت اور بے نظیر حافظہ کا۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ کہولت کے ساتھ ساتھ مزاج میں نسیان بھی بڑھتا جاتا ہے مگر میر صاحب کا حافظہ آخری وقت تک بدستور رہا۔ آخری عمر کے مضامین سے زیادہ ان کے وقتِ آخر کی باتیں ہیں جن سے استشہاد کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر انکے انتقال سے چار دن پہلے کا واقعہ ہے کہ ان کے صاحبزادے میر انتصار علی صاحب نے اِن کا دل بہلانے کیلئے کہا "دیکھئے آپکے بیٹے بیٹیاں۔ پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں سب آپکی خدمت کیلئے جمع ہیں۔ کیا انہیں دیکھکر آپکو خوشی نہیں ہوتی؟" تو متبسم ہوکر فرمایا ع "ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کرے؟" اِس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکے کیونکہ اسقدر نحیف و مُضمحل ہو گئے تھے کہ بولنا بھی مشکل سے جاتا تھا۔ اور ایک دفعہ یہ پوچھنے پر کہ "اب آپکی طبیعت کیسی ہے؟" فرمایا ؎

سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالب
خُدا سے کیا ستم و جورِ ناخُدا کہیئے

اُسکے تیسرے دن آپ نے انتقال فرمایا۔ اِنا للہ و اِنا الیہ راجعون۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

شاہد

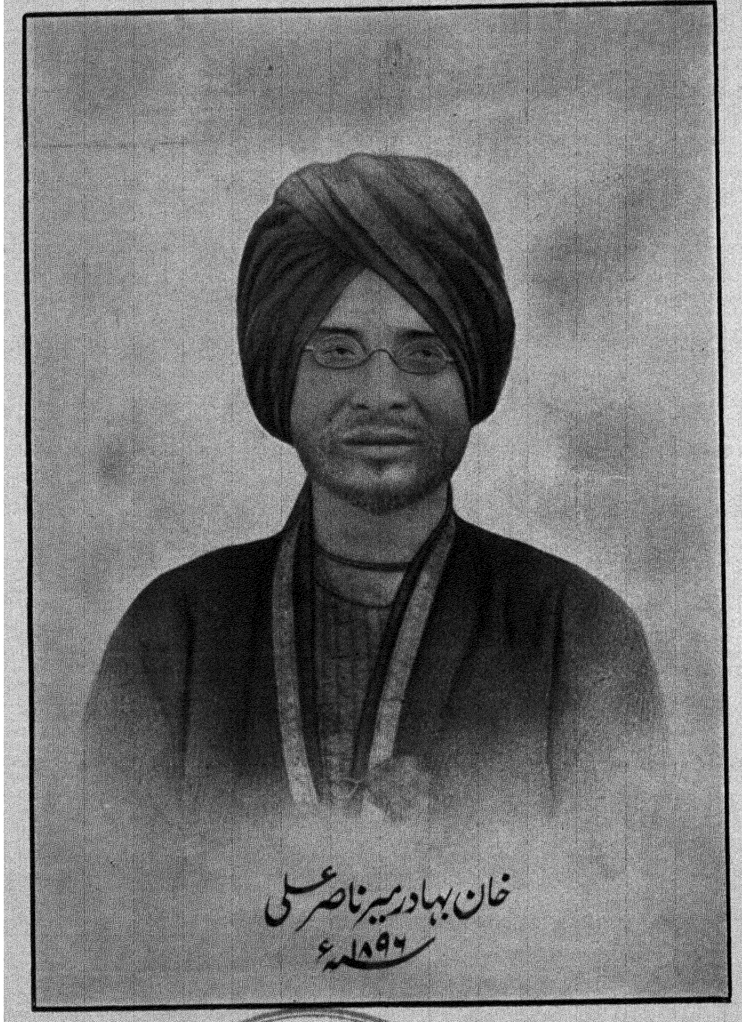
خان بہادر میر ناصر علی مرحوم

کیوں نہ ویران ہو دیارِ سخن
مر گیا آج تاجدارِ سخن

شاہجہاں آباد مٹ گیا۔ دلّی اُجڑ گئی، پُرانی صحبتیں ختم ہوئیں۔ جن چراغوں کی روشنی چار دانگِ عالم میں پھیلی ہوئی تھی سب ایک ایک کرکے بُجھ گئے۔ جن مقدّس صورتوں کے دم قدم سے دلّی کی ساکھ قائم تھی سب خاک میں مِل گئیں۔ صحبتِ شب کی شریک ایک آخری شمع جھلملا رہی تھی وہ بھی ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ آہ! میر ناصر علی خان بہادر کے نامِ نامی کے ساتھ آج "مرحوم" لکھتے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ بدنصیب اُردو کے سر اتنا بڑا سایہ اتنی جلدی اُٹھ جائیگا۔ شاہجہاں آباد کی جھلملاتی شمع یوں ایکدم سے گُل ہو جائیگی۔ افسوس! اُردو ادب کے اوّلین دور کا آخری ادیب ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گیا۔ مدّت ہوئی کہ اُردو کے شباب کی تاروں بھری رات خاتمے پر آچکی تھی۔ پچھلے پہر کا یہ آخری تارا باقی تھا سو وہ بھی رُوپوش ہوگیا اور اسی کے ساتھ قدیم مذاقِ سخن کا چراغِ سحری بھی گُل ہوگیا۔ زمانہ کتنی ہی ترقی کرے اس علم کے پُتلے کو پیدا نہیں کرسکتا۔ جہاں تک لائق ادب مشرقیت کا تعلق ہے قوم کی یہ آخری بہار تھی جس کے اجزا ایک ایک کرکے سب مِٹ گئے۔ قدیم علوم کے نام لیوا دو چار سے زیادہ نہیں۔ اُردو انشا پردازی خان بہادر میر ناصر علی کے ساتھ دفن ہوگئی۔

خاندان:۔ میر صاحب مرحوم کی پیدائش ۱۸۴۷ء میں دہلی میں ہوئی۔ آپ کا تعلق اُس خاندانِ سادات سے ہے جس میں پشت ہا پشت سے علم و فضل چلا آتا ہے۔ شجرہ حسب و نسب امام جعفرؓ صادق سے ملتا ہے۔ آپ کے اجدادِ اعلیٰ قاضی سید عبدالغفور مرحوم بزرگانِ کبار میں سے تھے اور خلفاءِ اسلامیہ کے زمانۂ حکومت میں "قاضی القضات" (Chief Justice) کے ممتاز عہدہ پر مامور تھے۔ آپ کے جدِّ امجد مولوی سید محمد علی مرحوم فضائلِ علوم صدری و معنوی میں یکتائے روزگار تھے اور بھوپال رزیڈنسی میں میر منشی تھے اور نواب صدیق علی خاں وزیرِ اعظم ناگپور کے معتمدِ اعلیٰ تھے۔ آپ کے والد ماجد مولوی سید ناصر الدین محمد ابوالمنصور دہلی کے جلیل القدر مولوی اور عالم مانے جاتے تھے۔ تمام علماءِ سُنّی و شیعہ اور ہندوستان کے بڑے بڑے مشائخ کے علاوہ عرب و عجم کے علماء و فضلا نے آپکو امام المناظرہ مانا تھا آپ نے بڑی بڑی کتابیں تصنیف کیں جن کا شہرہ چار دانگ عالم میں ہے۔

"SAQI"



مولوی نصرت علی مرحوم

میر صاحب مرحوم کے برادرِ عزیز مولوی سید نصرت علی مرحوم بڑی لیاقت و فضیلت کے بزرگ تھے۔ آپ میر صاحب مرحوم سے صرف تین برس چھوٹے تھے اور اُن سے چھ ماہ پیشتر اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ افسوس مادرِ ہند کے یہ دو چشم و چراغ ایک ہی سال میں چٹ پٹ ہو گئے۔ مولوی نصرت علی مرحوم کو علوم دینی۔ فقہ و حدیث میں یدطولیٰ حاصل تھے۔ چنانچہ اسوقت مرحوم کی تصنیف کردہ کتابیں ایک سو سے زائد ہیں۔ فارسی و عربی میں بھی مرحوم جیدِ عالم تسلیم کئے جاتے تھے سنہ ۱۸۷۲ء سے مرحوم نے "نصرت الاخبار" جاری کیا جس کے دو ضمیمے تھے، ایک مہرِ درخشاں اور دوسرا نصرت الاسلام۔ یہ تینوں اخبار مرحوم کے ذاتی پریس نصرت المطابع سے شائع ہوتے تھے۔ اُس زمانہ میں نور افشاں نامی عیسائیوں کا ایک پرچہ شائع ہوتا تھا جس میں اسلام پر اعتراضات کئے جاتے تھے۔ اُس کے جواب میں مولوی نصرت علی مرحوم نے مہرِ درخشاں شائع کیا جس میں مرحوم بڑی شدّ و مدّ سے اُن اعتراضات کو رد کیا کرتے تھے نصرت الاسلام میں اسلامی خبریں اور مضامین شائع ہوتے تھے اور نصرت الاخبار میں ہر قسم کی خبریں اور مضامین شائع ہوتے تھے۔ نصرت الاسلام کی بجائے ناصر الاسلام نکلنا شروع ہوا جو دس پندرہ برس تک شائع ہوتا رہا۔ آخری وقت تک مرحوم درس و تدریس اور تبلیغ و اشاعت اسلام میں مُنہمک رہے اور بتاریخ ۲ نومبر سنہ ۱۹۳۲ء بمقام ریاست اجے گڈھ انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! بہت جلد مرحوم کے حالات زندگی کسی آیندہ اشاعت میں شائع کئے جائیں گے۔

میر صاحب مرحوم کے بچپن کے حالات:- آغازِ عمر میر صاحب کا لکھنؤ میں صرف ہوا کچھ عرصہ بعد دہلی آ گئے تھے اور دہلی سے پھر اپنے والد ماجد کے ساتھ دائی پور تشریف لے گئے تھے۔ ۱۰ برس کی عمر تک وہیں رہے اور وہیں میر صاحب مرحوم نے قرآن شریف پڑھا۔ اُن کے بچپن کے حالات زیادہ نہیں معلوم ہو سکے۔

غدر:- سنہ ۱۸۵۷ء میں میر صاحب مرحوم دس برس کے تھے اور مولوی نصرت علی مرحوم سات برس کے۔ غدر کے متعلق ایک خاص واقعہ میر صاحب مرحوم اکثر سُنایا کرتے تھے:- "والد دائی پور کے عزیزوں سے لڑکر دلّی آ رہے تھے۔ غدر کے ہنگامے کی وجہ سے سوائے چھکڑے کے اور کوئی سواری نہ مل سکی۔ اُسی پر بیٹھکر دلّی کی طرف روانہ ہوئے' والد، والدہ، میں اور نصرت علی صرف چار آدمی تھے۔ آدھے راستے چل کر چھکڑے والے نے خدا معلوم کس وجہ سے ہم سبکو زبردستی اُتار دیا۔ بڑی پریشانی ہوئی۔ واپس دائی پور جانا منظور نہ تھا۔ ناچار پیدل چلنا پڑا۔ مختصر اسباب جو ساتھ تھا وہ بانٹ لیا گیا۔ میرے حصّہ میں والدہ کی پٹاری آئی جو بہت بھاری تھی۔ میرے پیٹ میں تلی بھی تھی۔ نصرت علی شروع سے والد کے لاڈلے تھے، وہ خالی ہاتھ چل رہے تھے اور میں جل جل کر اُن کو کوس رہا تھا۔ راستے میں ایک گڑھا آیا اور میں اتفاقاً اُس میں گر پڑا۔ پٹاری کھُل گئی۔ والد بہت خفا ہوئے مگر چوٹ لگ جانے کے بہانے سے پٹاری ہم سے لے لی گئی اور ہم نصرت علی کی

طرح اتر اکر خالی ہاتھ چلنے لگے"۔

جب ہنگامہ ذرا کم ہوا اور شہر میں امن و امان قائم ہو گیا تو مولوی ابوالمنصور مرحوم نے میر مداری کی گلی میں ایک مختصر مکان کرایہ پر لے لیا اور وہیں رہنے سہنے لگے۔ اوائل میں تنگی ترشی سے بسر ہوتی تھی لیکن کچھ عرصے بعد حالات موافق ہو گئے۔

ابتدائی تعلیم:- قرآن پاک ختم کرنیکے بعد دونوں بھائیوں کو دہلی کے جلیل القدر عالم مولوی نجم الدین مرحوم کے سپرد کر دیا گیا۔ اُنہوں نے عربی و فارسی میں اعلیٰ مدارج تک تعلیم دی۔ کبھی کبھی مولوی ابوالمنصور مرحوم خود بھی پڑھایا کرتے تھے۔ دینیات، فقہ و حدیث میں اعلیٰ تعلیم دی گئی۔ شروع ہی سے میر صاحب مرحوم کا ذہن بہت تیز تھا، چنانچہ مشکل سے مشکل مسائل معمولی غور کے بعد سمجھ جایا کرتے تھے۔ مولوی نصرت علی مرحوم پر زیادہ سختی نہیں ہوتی تھی لیکن میر صاحب مرحوم کو خفیف سی فروگذاشت پر بھی سزا دی جاتی تھی۔ مرحوم اس قسم کی سزاؤں کا ذکر فرمایا کرتے تھے، "والد خود تو نہیں مارتے تھے لیکن نصرت علی سے پٹوایا کرتے تھے جس سے ہمیں اور بھی غیرت آتی تھی"۔

ابھی اکتساب اور تحصیل کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ابوالمنصور مرحوم کے ایک ملنے والے نے میر صاحب مرحوم کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت دیکھکر مرحوم کو حضرت نظام الدین شاہ اولیا کے مدرسے میں پندرہ روپے ماہوار پر مدرس کی حیثیت سے نوکر رکھوا دیا۔ اس سے مرحوم کو بہت خوشی ہوئی اور یہیں سے مرحوم کو عزت اور ناموری حاصل کرنے کا شوق ہوا۔ اس مدرسے میں مرحوم کچھ دنوں تک ملازم رہے۔ اکثر اس زمانہ کا ذکر فخر سے سنایا کرتے تھے۔ "تم کیا پڑھ سکتے ہو صاحبزادے! ہم نے چراغ کی روشنی میں بڑی بڑی کتابیں ہضم کی ہیں اور تم سے بجلی کی روشنی میں بھی نہیں پڑھا جاتا۔ غدر کے بعد ہم نظام الدین اولیا کے مدرسے میں مقرر ہو گئے تھے، روز صبح کو یہاں سے جاتے تھے اور شام کو واپس آتے تھے۔ والدہ دو بیسنی روٹیاں اور ایک پیاز کی گٹھی ایک رومال میں باندھ کر ساتھ کر دیتی تھیں اور یہی دو روٹیاں ہمیں دن بھر کو کافی ہوتی تھیں"۔

انگریزی تعلیم:- مولوی ابوالمنصور مرحوم کے پاس بڑے بڑے پادری بحث کرنے آتے تھے۔ بارہا میر صاحب مرحوم کو اس صحبت میں شریک ہونیکا موقع ملا اور یہیں سے اُن کو انگریزی زبان سیکھنے کا شوق ہوا، تفوق اور امتیاز حاصل کرنے کی تمنا اُن کو ہمیشہ ترقی کی طرف مائل کرتی رہی۔ چنانچہ اُنہوں نے نہ معلوم کس طرح اور کیونکر مگر انگریزی پڑھنی شروع کر دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انگریزی پڑھنا کفر سمجھا جاتا تھا۔ اور کہاں یہ کہ ایسے جید مولوی اور امام المناظرہ کا لڑکا اس کفر کا ارتکاب کرے، جتنا کچھ بھی طوفان برپا ہوتا کم تھا۔ مرحوم کو بھی اس کا احساس تھا مگر تحصیل کے شوق نے ان کو ان فروعات کا خیال نہ کرنے دیا اور وہ چوری چھپے انگریزی پڑھتے رہے۔ لیکن اتنی بڑی بات کیوں کر چھپی رہ سکتی تھی۔ معلوم ہو ہی گیا۔ سب سے پہلے تو مولوی ابوالمنصور مرحوم نے خوب خبر لی۔ خوب ناراض ہوئے۔ اسکے بعد مولوی نجم الدین مرحوم نے گوشمالی کی۔ میر صاحب مرحوم نے

اسی میں اپنی خیریت سمجھی کہ توبہ کرلیں۔ اور یہی کیا۔ بہت دنوں تک دل پر جبر کئے بیٹھے رہے۔ رفتہ رفتہ مولویوں کی ذہنیت تبدیل ہوئی۔ اُنھوں نے پھر چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ غرض بہت کچھ ردّ و کد کے بعد مرحوم کو انگریزی پڑھنے کی اجازت مل گئی اور ان کو دہلی گورنمنٹ اورینٹل کالج میں داخل کردیا گیا۔ یہاں مرحوم نے خوب محنت سے پڑھا اور ۱۸۶۷ء میں انٹرنس کے امتحان میں اوّل آئے۔ سرلیپل گریفن بالقابہ (Sir Lepel Greffin) نے ایک طلائی تمغہ اور پندرہ روپے نقد بطور انعام عطا کئے۔ اس اعزاز سے مرحوم کو جو قلبی مسرت ہوئی اُس کا اکثر تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے اُن ۱۵ روپوں کی ایک طلائی نتھ اپنی والدہ محترمہ کے لئے بنوائی۔ مرحوم اپنی اس سعادت پر اکثر فخر کیا کرتے تھے۔

شادی:۔ انٹرنس پاس کرنے کے کچھ عرصہ بعد آپ کی شادی میر احمد علی رئیس کی دُختر نیک اختر سے ہوئی۔ مولوی نصرت علی مرحوم کی شادی بھی میر احمد علی رئیس کی دوسری لڑکی سے ہوئی تھی۔

سلسلۂ ملازمت:۔

ہیڈ ماسٹر۔ نان پارہ:۔ ۱۸۶۷ء میں دہلی گورنمنٹ اورینٹل کالج سے انٹرنس پاس کرتے ہی میر صاحب مرحوم کو نان پارہ ضلع بہرائچ میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے مقرر کردیا گیا۔ یہاں مرحوم ایک سال تک رہے۔

محکمۂ نمک شمالی ہند:۔ ۱۸۶۸ء میں نان پارہ اسکول سے میر صاحب مرحوم کی خدمات محکمۂ نمک شمالی ہند میں منتقل ہوگئیں۔ اس محکمہ میں مرحوم نے ۱۸۶۸ء سے ۱۹۰۸ء تک نہایت نیکنامی سے اپنے فرائضِ منصبی انجام دیتے رہے اور اپنی محنت اور قابلیت کی وجہ سے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے تک پہونچے۔ محکمہ نمک کی ملازمت کے سلسلے میں مرحوم شمالی ہندوستان کے مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً تعینات رہے لیکن آخر میں آپ کا تبادلہ فرخ نگر۔ ضلع گوڑگانوہ میں ہوگیا۔ جہاں آپ مستقل طور پر بیس برس سے زیادہ رہے اور یہیں سے پنشن پائی۔ آپ کی گراں قدر خدمات کے صلے میں ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ ہند سے "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں آپ کو "کورونیشن سرٹیفکٹ" عطا ہوا۔ سارے محکمۂ نمک میں صرف آپ ہی وہ خوش نصیب شخص تھے جن کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔ اپنے قیامِ فرخ نگر کے دوران میں آپ سرکاری کام کے علاوہ مُلک کی معاشرتی حالت کی خدمت و اصلاح میں ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے۔ چنانچہ ضلع گوڑگانوہ میں ۱۸۹۶ء میں جو خوفناک قحط برپا ہوا اُس کے انسداد میں مرحوم نے جس تن دہی اور جانفشانی سے کام کیا وہ ہر طرح لائقِ تعظیم ہے۔ پنجاب گورنمنٹ گزٹ بابت ۱۰ مارچ ۱۸۹۸ء میں سرکارِ عالی نے آپ کی ان نیک خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اظہارِ تشکر کیا۔

علاوہ ازیں مرحوم فرخ نگر میونسپل کمیٹی میں متواتر ۱۶ برس تک نائب صدر کی خدمات نہایت حُسن و خوبی سے انجام دیتے رہے اور حق یہ ہے کہ قصبہ کی تمدنی اور معاشرتی حالت میں جو جو گراں قدر اصلاحیں آپ نے

کیں وہ عرصۂ دراز تک یادگار رہیں گی۔ آج تک فرخ نگر کی مجلسِ بلدیہ کو مرحوم جیسا لائق نائب صدر نہیں ملا اور نہ آیندہ امید ہے۔ آپ کے حسنِ خدمات کے صلے میں گورنمنٹ ہند سے بے شمار اسناد ملیں۔ ایک "گورنمنٹ سرٹیفکٹ" مکرر عطا ہوا۔ علاوہ ازیں بمقام شیخوپورہ۔ لائل پور آپکو ۵ قطعہ آراضی سرکار سے بطور انعام ملے۔

آنریری مجسٹریٹ۔ دہلی:- محکمۂ نمک سے پنشن حاصل کر لینے کے کچھ عرصہ بعد آپکو گورنمنٹ عالیہ کی طرف سے آنریری مجسٹریٹ درجہ دوم کے اختیارات عطا کئے گئے۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۳ء تک آپ نے دہلی میں آنریری مجسٹریٹ کی خدمات انجام دیں۔ اس زمانے میں مرحوم نے ایک فٹن بھی رکھ لی تھی۔ مرحوم بڑے احتشام سے اجلاس کرنے تشریف لے جایا کرتے تھے۔

چیف منسٹر ریاست پاٹودی:- ابھی مجسٹریٹی کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ریاست پاٹودی میں مُشیر کی ضرورت ہوئی۔ حکومت کو ایک ایسے تجربہ کار افسر کی تلاش ہوئی جو ریاست کو سنبھال سکتا۔ نظرِ انتخاب میر صاحب مرحوم پر پڑی۔ چنانچہ مرحوم کو فوراً چیف منسٹر کی حیثیت سے ریاست پاٹودی میں تعینات کر دیا گیا اور ریاست کے انتظام سے متعلق کم وبیش تمام حقوق دیدیئے گئے۔ یہاں بھی مرحوم نے نہایت نیک نیتی اور خوش سلیقگی سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۲ء تک آپ پاٹودی کے دیوان رہے، موجودہ نواب ہز ہائی نس نواب افتخار علی خاں بالقابہ کے عالی قدر جدِ امجد ہز ہائی نس نواب مظفر علی خان بہادر کے زمانے میں آپ پاٹودی تشریف لے گئے تھے اور موجودہ نواب صاحب بہادر کی ولایت کو روانگی کے وقت وہاں سے رُخصت ہوئے۔ اس نو سال کے عرصہ میں مرحوم نے جس حسنِ تدبیر سے ایسے نازک وقت میں جبکہ جنگ عظیم نے ایک عالم کے خیال میں انقلاب پیدا کر دیا تھا اور سوراج کے خیالی پھریرے آسمانِ ہندوستان میں لہرا چکے تھے اور آزادی کی صدا ہر دماغ میں گونج چکی تھی۔ ریاست۔ رعایا وجملہ ملازمان کو سرکارِ عالیہ کے سلک خیر خواہی میں امام بنائے رکھا۔ پاٹودی میں آپ کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ روانگی کے وقت ساری رعایا ڈاڑھیں مار مار کر رو رہی تھی۔ بیگم صاحبہ پاٹودی دام اقبالہا کو بھی مرحوم کی روانگی کا بہت صدمہ ہوا۔

جنگِ عظیم:- دورانِ جنگ عظیم میں مرحوم نے سرکارِ برطانیہ کی ہر ممکن طریقہ سے خدمت کی۔ اپنے ذاتی رسوخ اور تحریر وتقریر سے آپنے امدادی چندے کے بہم پہونچانے میں بہت کوشش کی۔ قرضۂ جنگ کے سلسلہ میں بھی مرحوم نے اپنا تمام وقت اور ذرائع اسی ترغیب میں صرف کئے۔ غرض ہر طرح وہ رعایا کو خیر خواہی پر آمادہ کئے رہے۔ ان اعلیٰ خدمات کے صلے میں گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے گزٹ آف انڈیا بابتہ ۲۹ ر جولائی ۱۹۱۹ء میں میر صاحب کی حسنِ خدمات اور خیر خواہی کا شکریہ ادا کیا گیا اور ایک "تمغۂ جنگ" (War Medal) بطور انعام عطا ہوا۔ علاوہ ازیں عالی جناب ارل آف کارن وانس بہادر کی تالیف کردہ

کتاب (Royal Rulers & Leaders of the East) میں (جس کا مقدمہ عالیجناب فیلڈ مارشل ارل ہیگ بہادر نے لکھا ہے) میر صاحب مرحوم کا تذکرہ خاندان درج کیا گیا اور اُن کی خیرخواہی کا اعتراف کیا گیا۔ یہ تصنیف بڑے وقار کی چیز ہے جو ہمیشہ تک یادگار رہے گی۔

میر صاحب مرحوم کے زمانۂ ملازمت پر ایک نظر ڈالنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قطعاً self made انسان تھے اور کبھی کسی کی سعی و سفارش کے محتاج نہیں ہوئے۔ محض اپنی قوت بازو اور اپنی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے یہ اعزاز حاصل کئے۔ مرحوم اکثر دورانِ گفتگو میں اس کا تذکرہ کرتے تھے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ "میں نے قسم کھالی تھی کہ اپنے ہم چشموں سے کسی طرح کم نہ رہونگا اور اسی ایک خیال کی بدولت میں ترقی پر ترقی کرتا گیا"۔ اسی سلسلہ میں مرحوم نے ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ "میرے والد ماجد نے مجھے یہ شعر حفظ کروایا تھا تو بھی یہ شعر یاد رکھیو۔ جوان لڑکوں کے لئے اس سے بہتر (Motto) (اصولِ حیات) نہیں ہو سکتا"۔ شعر یہ ہے ؎

اے نخلِ عمر! دن تو یہی ہیں بہار کے — پھولے گا اور کب جو نہ پھولیگا آج کل

حُلیہ:- میر صاحب مرحوم کا قد جوانی میں لمبا ہوگا۔ ضعیفی کے تقاضے سے کمر ذرا جُھک گئی تھی، بدن دُہرا تھا۔ رنگ کھُلا ہوا گندمی۔ چہرہ صاف، بھرا ہوا اور پُر رُعب۔ بلند اور چوڑی پیشانی۔ بھویں جدا اور باریک ہلالی شکل کی۔ آنکھیں نہ بڑی نہ چھوٹی۔ (اس موقع پر ایک لطیف چیز بیان کرنیکے قابل ہے، مرحوم جب کسی سے ناراض ہوتے تھے یا چیں بجبیں ہو کر بحث کرتے تھے تو جذبات کے غلبہ سے اکثر آنکھیں بند ہو جایا کرتی تھیں۔ اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ مرحوم کسی فروگذاشت پر مجھ سے ناراض ہوتے اور جہاں میں نے آنکھیں بند دیکھیں اور میں وہاں سے کھسکا۔ میرے چلے جانے پر بھی اُن کا لکچر جاری رہتا جب آنکھیں کھولتے تو دیکھتے کہ معتوب فرار ہو چکا۔ پھر یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے "بھاگ گیا مُفت خورہ!!!) ناک ستواں اور نتھنوں پر قدرے پھیلی ہوئی۔ دہانہ متوسط۔ دانت جلد ہی ٹوٹ گئے تھے۔ اور مصنوعی دانت لگوانے سے اُنہیں نفرت تھی۔ گردن لمبی اور موٹی۔ ڈاڑھی مختصر اور بھری ہوئی، سر کے بال خشخاشی۔ ہاتھ پاؤں بھرے بھرے۔ پاؤں خاصہ بڑا تھا جس سے "پیر بڑا گنوار کا" کی تکذیب ہوتی تھی۔ ڈیل ڈول ہمیشہ گدا ز رہا جو دُبلے اور موٹے کے درمیان تھا۔ آخیر وقت میں نقاہت اور دائمی بیماری سے بہت کمزور اور لاغر ہو گئے تھے۔ چہرہ رُعب دار تھا اور مجموعی حالت سے شرافت اور نیک دلی ٹپکتی تھی۔ رفتار جوانی میں تیز ہوگی مگر بڑھاپے میں سُست ہو گئی تھی۔ آواز متوسط بلکہ ایک حد تک دھیمی تھی تیزی سے بولتے تھے۔ استدلال کرتے وقت "یہ درست ہے لیکن عموماً ....!" "اس سے غرض نہیں کہ ...." کا استعمال زیادہ کرتے تھے۔ لیکن اس سے یہ نہ اخذ کیا جائے کہ یہ اُن کا تکیہ کلام تھا۔

وضع لباس اور طریق بود و باش: لباس کے معاملے میں مرحوم غیر معمولی طور سے محتاط تھے۔ مجھے اپنے بچپن کا وہ شعر ابھی تک یاد ہے جو مرحوم نے زبردستی حفظ کروایا تھا۔

غرض از جامہ رفعِ ہر و برد است ندارد میلِ زینت ہر کہ مرد است

مرحوم اسی کلیہ پر آخر وقت تک کاربند رہے۔ ہمیشہ صوفیانہ لباس مرغوب طبع رہا۔ شروع ملازمت میں نیچے دامن کے کرتے پر انگرکھا پہنتے تھے اور اُس پر ایک چُغہ مستزاد۔ سر پر عربی عمامہ گلے میں پٹکا ایک برا پاجامہ، اور پاؤں میں سادہ نری کی سلیم شاہی۔ جب انگرکھے کا رواج جاتا رہا تو شیروانی پہننے لگے۔ جب کبھی افسران سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو انگریزی بوٹ پہن لیتے تھے۔ بس یہی کل کائنات تھی۔ پنشن لینے کے بعد لباس کی طرف سے اور بھی استغنا اختیار کر لیا تھا معمولی ململ کا کُرتا اور سیدھی موری کا پاجامہ۔ سر پر گول وضع کی ٹوپی۔ اچکن اور شیروانی کو بھی ترک کر دیا تھا۔ جاڑے میں گرم ٹوپی پہنتے تھے، فلالین کا کُرتا اور دائیلا کا پاجامہ۔ کبھی کبھی فتوی اور موزہ بھی پہن لیتے تھے ایک لکڑی ضرور ہاتھ میں رکھتے تھے اور اکثر اُس لکڑی کی تعریف کرتے تھے۔ فرماتے تھے "مجھ سے زیادہ اِس لکڑی کو میری ضعیفی کا خیال ہے"۔

رہنے سہنے کا طریقہ بھی بہت سادہ تھا۔ پاٹودی سے واپسی کے بعد بالاخانے کے دو کمرے اور ایک کوٹھڑی اپنے لئے مخصوص کر لی تھی۔ اوائل میں بڑے کمرے میں نشست برخاست تھی۔ چونکہ فرنیچر اور آرائشی سامان کا بہت شوق تھا اس لئے کمرہ عروسِ نو کی طرح آراستہ رہتا تھا۔ جابجا بیش قیمت قلمی تصاویر آویزاں تھیں۔ اعلیٰ قسم کا فرنیچر اور نفیس ایرانی قالینوں کی افراط تھی۔ مجھے یاد ہے جب خاں صاحب محمد علی مرحوم کی تحریک سے انجمن پنشن خواران کی افتتاح ہوئی تو اُس کے اجلاس اسی کمرے میں ہوتے تھے۔ اکثر اربابِ سخن کے اجتماع بھی ہوتے۔ ایک مرتبہ مولوی سبحان اللہ صاحب گورکھپور سے تشریف لائے تو مرحوم نے جمیع احباب کو دعوتِ چاء دی جس کے مہتمم میرے والد ماجد تھے۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب مرحوم۔ مولوی اشرف حسین صاحب مرحوم۔ خانصاحب محمد علی مرحوم۔ خضر دہلوی۔ سائل دہلوی۔ بسمل دہلوی۔ لالہ سری رام مرحوم اور بہت سے حضرات جمع ہوئے اور کئی گھنٹے تک صحبتِ شعر و سخن گرم رہی۔ اس قسم کے اجتماع وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے تھے مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے انتقال کے بعد پُرانی صحبتیں درہم برہم ہو گئیں۔ کچھ عرصے بعد محمد علی خاں بھی اللہ کو پیارے ہوئے مولوی اشرف حسین صاحب اُن سے پہلے ہی رحلت کر چکے تھے۔ اِدھر میر صاحب نے بھی گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ بڑے کمرے کو چھوڑ کوٹھڑی میں زیادہ تر بیٹھنے اُٹھنے لگے۔ جاڑے میں تو خاص طور سے کوٹھڑی ہی میں انگیٹھی کے آگے بیٹھے رہتے تھے، اگر کوئی ملنے آتا تو برابر والے کمرے میں آجاتے ورنہ دن دن بھر اُسی کوٹھڑی میں روئی کے ایک گدّے پر لیٹے پڑھتے رہتے اُسی کوٹھڑی کے ایک کونے میں میز کرسی لگی ہوئی تھی جس پر بیٹھکر مرحوم مضامین لکھا کرتے تھے یہ کوٹھڑی انہیں اتنی عزیز تھی کہ اسکا چھوڑنا کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ میرے والد ماجد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"بیٹا!

یہ مہینہ دسمبر کا ہے جس کے آخر میں تم آؤ گے۔ اب اس میں تھوڑے دن باقی ہیں پھر بھی میں بہانے ڈھونڈا کرتا ہوں کہ جب تک تم آؤ تم سے باتیں کرنے کا کوئی نہ کوئی حیلہ نکل آئے۔ کل لالہ سری رام کا خط ولایت سے آیا جس میں اُنہوں نے لندن کا مفصل حال لکھا ہے۔ مگر میں نے ولایت تو در کنار سمندر، جہاز، کلکتہ، بمبئی، مدراس وغیرہ بھی نہیں دیکھے۔ مجھے تمام دُنیا میں ہندوستان ہندوستان میں دلّی۔ دلّی میں فراشخانہ۔ فراشخانہ میں اپنا گھر اور اس گھر میں یہ کوٹھڑی پسند ہے جس میں انگیٹھی جل رہی ہے اور بجلی روشن ہے۔ میں انگیٹھی سے چمٹا ہوا بیٹھا ہوں۔ اخبار رسالوں اور کتابوں کا ڈھیر ہے۔ ایک کتاب سے جی ہٹا تو دوسری اُٹھالی اور سب سے گھبرا گیا تو گدّے پر پڑ رہا۔ بیٹی حمّی کھانا کھلانے اور چھوٹی ممّی چاء پلانے کو آگئیں۔"

کھانے میں کوئی تکلف نہیں ہوتی تھی۔ معمولی کھانا دونوں وقت کھاتے تھے۔ البتہ چاء بہت تکلّف سے پیتے تھے۔ نماز کے وقت سے چاء کی تیاری شروع ہوتی تھی اور سات بجے تک ختم ہو جاتی تھی۔ صبح کی چاء میں کسی کو بلاتے نہیں تھے۔ خود کوئی آجائے تو خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سے چاء کا شوق ظاہر ہوتا ہے۔ مجھے اکثر یہ سعادت حاصل ہوئی۔ صبح کی چاء میں لوازمات بھی زیادہ ہوتے تھے۔ کچوریاں۔ انڈے۔ مکھن۔ ٹوس وغیرہ۔ مرحوم فرماتے تھے کہ علی الصبح کچھ نہ کچھ کھا لینا نہایت ضروری ہے۔ اس شعر کی بار بار تلقین فرماتے تھے ؎

یک لقمہ ءِ پگاہی بہتر زمرغ و ماہی

میرے چچا کے دو چھوٹے لڑکے جن کو مرحوم شہدن اور پہلوان کہا کرتے تھے۔ اُنکے ساتھ چاء پینے کے اسقدر شوقین تھے کہ ٹھیٹ جاڑوں میں بھی ۵ بجے سے آکر چاء بنانیکا تقاضہ کرتے تھے۔ مرحوم کو یہ دونوں بچّے اِسی وجہ سے عزیز تھے۔ بڑا لڑکا شہدن جس کی عمر ۸ سال کی تھی، مرحوم سے کہا کرتا تھا کہ میں تو آپ کا بیٹا بنونگا اُس کے متعلق مرحوم نے یہ شعر کہا ؎

بنا ہو دادا کا بیٹا پھر اہی اتراتا وگرنہ کنبہ میں شہدن کی آبرو کیا ہے

سہ پہر کی چاء تین بجے سے بنواتے تھے اور گھر کے تمام آدمیوں کو اصرار سے جمع کرتے تھے اور زبردستی چاء پلاتے تھے۔ سہ پہر کی چاء میں پنیر۔ بسکٹ اور اناس کا مُربہ ضرور ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں موسمی ترکاریوں میں سے انگور سردہ وغیرہ بھی ہوتا تھا۔ تھوڑی تھوڑی سی چیز سبکو دیتے تھے اور بار بار پوچھتے تھے "تجھے پنیر ملا؟ بسکٹ ملا؟" ہم لوگ ایک ایک حصّہ لینے کے بعد بھی شرارت اور لالچ سے کہدیا کرتے "جی نہیں" اور مرحوم دوبارہ سب چیزیں دیدیتے تھے۔ افسوس! اس محبت سے چاء پلانے والا اب کہاں!!! سب کو جمع کر کے چاء پلانے سے اُن کو حقیقی مسرت ہوتی تھی۔ میرے والد ماجد کے خطوں میں اکثر اسکا تذکرہ ہوتا تھا:-

"بیٹا!

تمہارا خط کل تیسرے پہر کو مجھے ملا - ارادہ کیا کہ اُسی وقت جواب لکھوں - کیونکہ جواب سے غرض تم سے باتیں کرنی ہوتی ہیں - لیکن باتیں اُسی وقت اچھی طرح ہو سکتی ہیں جبکہ دل خوش ہو اور طبیعت کو اُلجھن نہ ہو - اس لئے آج صبح کی چاء پی کر انگیٹھی کے پاس بجلی کی روشنی میں تمہیں لکھنے بیٹھا ہوں - پہلے اس وقت کی چاء کا حال سن لو - ۵ بجے صبح سے انگیٹھی گرم ہوئی - اس کے بعد چاء پینے والے اور والیاں جمع ہونے لگیں - سترہ آدمی لڑکے اور لڑکیوں نے چاء ساتھ پی - سب سے مقدم چاء کے اہتمام میں نئی بیگم ہیں جن کا نام بچھلی دیوالی سے بچھی ہو گیا ہے - اُنکے ذمے دونوں وقت کیا بلکہ ہر وقت میری چاء کا انتظام ہے - کھانا کھلانیکی نوکری دونوں وقت کی اُن کی بڑی بہن ممّی کے ذمے ہے - یہ دونوں لڑکیاں چاء اور کھانے میں بہت آرام دیتی ہیں - چاء میں اکثر یہ چیزیں ہوتی ہیں بکھن ٹوسٹ پنیر - پاپے - پاپڑ - جیلی اور سب سے عمدہ چیز بھوڑیاں گرم گرم - گرم گرم اس لئے کہ کڑھائی یہیں چڑھتی اور کڑھائی سے گرم گرم اُترتی جاتی ہیں اور میں کھاتا جاتا ہوں - بھوڑیاں کباب کے ساتھ کھائی جاتی ہیں - چاء بہت نفیس ہوتی ہے جو پانچ روپے پونڈ سے کم کی نہیں ہوتی - اس سے زیادہ تکلّف کی چاء ممکن نہیں - یہ سب سات بجے تک چاء پی پلا کر رخصت ہو جاتی ہیں اور میں اپنے لکھنے پڑھنے کے دھندے میں لگ جاتا ہوں - تم بتاؤ تم کو یہ لُطف حاصل ہے ؟ مگر تم ابھی نوکری کے دھیان میں لگے رہو اور میری طرف سے اطمینان رکھو - میرے آرام کا خیال سب سے زیادہ تمہاری بیوی اور لڑکیوں کو ہے ...."

اس قسم کی آخری چاء جس میں قریب قریب سب شریک تھے، انتقال سے چار روز پیشتر یعنی ۸ رجون کو مرحوم کے سونے کے کمرے میں پی گئی -

پاٹودی سے واپسی کے بعد سے کھانے کا انتظام مستقل طور پر میری بڑی پھوپھی صاحبہ کے سپرد تھا اور چاء کا اہتمام وقتاً فوقتاً مختلف عزیزوں کے ذمے رہا - آخری تین یا چار سال سے میری منجھلی پھوپھی صاحبہ (والدہ عزیزی ولایت حسین) چاء کی انچارج تھیں -

صداقت اور صاف دلی:- راست بازی میر صاحب مرحوم کے خمیر میں داخل تھی - زندگی کے ہر شعبہ میں صداقت سے کام لیتے تھے - جو دل میں ہوتا وہی زبان پر بھی ہوتا اور حقیقت میں اُنکی زبان اور اُن کا قلم دونوں اُن کی کیفیتِ قلب کی سچی ترجمانی کرتے رہے - مکاری - ریاکاری - چال بازی سے قطعاً ناآشنا تھے - راست بازی کی وجہ سے بارہا نقصان بھی اُٹھائے - ایک واقعہ کا اکثر تذکرہ کرتے تھے - فرماتے تھے کہ "میرے علاقہ میں ایک مرتبہ کمشنر دورے پر آیا - دفتر کا معائنہ کیا - Accounts (حساب کتاب) کے کاغذات دیکھکر کہا "میر صاحب آپ صاف نہیں لکھتے - جگہ بہ جگہ کاٹا چھانٹی کرتے ہیں" میں نے

کہا حضور۔ مکاری مجھے آتی نہیں۔ یہ کاٹ چھانٹ تو میری ایمانداری کی دلیل ہے۔ جہاں غلطی دیکھتا ہوں قلمزد کر دیتا ہوں۔ کمشنر یہ جواب سن کر بہت خوش ہوا۔"

اسی طرح وہ انتہا درجہ کے صاف دل بھی تھے۔ کبھی کسی سے بغض و کینہ نہ رکھا۔ جس سے ملتے تھے خوش ہو کر۔ اگر ناراض ہوتے تو صاف طور پر اظہار ناراضگی کرتے۔ لگی لپٹی باتوں کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔

رحمدلی اور نیک نیتی:- مرحوم انتہا درجہ کے رحمدل واقع ہوئے تھے۔ کبھی کسی انسان یا حیوان کو انہوں نے اپنی ذات سے تکلیف نہیں پہونچائی۔ وہ حد درجہ کے منکسر المزاج، صلح خو اور صلح جو واقع ہوئے تھے اور کسی کے جذبات کو زبان و قلم تو ایک طرف اپنی کسی معمولی حرکت سے بھی دانستہ صدمہ نہیں پہونچایا۔ اس کی شہادت یوں مل سکتی ہے کہ آج کوئی متنفس ایسا نہیں، جو اسکی تردید کر سکے۔ وہ سب سے اور سب اُن سے خوش رہتے تھے۔ اگر کسی کا دکھ دور نہیں کر سکتے تھے تو یہی کافی سمجھتے تھے کہ اُسے اور زیادہ تکلیف نہ پہونچائی جائے۔ حیوانات کے متعلق یہ ہے کہ انہوں نے شکار کے نام کبھی مچھر بھی نہیں مارا۔ گھر میں کئی مقامات پر پرندوں کے لئے پانی کی کنڈالیاں رکھی رہتی تھیں۔ اور ملازم کو خاص ہدایت تھی کہ روزانہ کنڈالیوں کو صاف کر کے تازہ پانی بھرے۔ اُن کے کمرے پر بجلی کا کھمبا لگا ہوا تھا اُس پر چیلیں بیٹھا کرتی تھیں۔ میرے والد ماجد اُن چیلوں کو اُڑواتے تھے اس لئے کہ اُن کی آواز منحوس سمجھی جاتی ہے۔ مگر مرحوم ہمیشہ مانع آتے اور کہتے کہ تمہارا کیا لیتی ہیں معصوم جانور ہیں۔ ان کی بولی ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ فرخ نگر میں اُن کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ گشت میں جانے کے لئے تیار ہیں۔ منجھولی آئی۔ اُن کے بیٹھتے ہی بیل اڑے اور گردن وغیرہ ہلائی مرحوم فوراً اُتر گئے اور کہا کہ آج انکی مرضی نہیں ہم پیدل چلے جائیں گے۔

اُن کا عقیدہ تھا کہ "ہر کام میں نیت کو بڑا دخل ہے۔ اگر نیت اچھی ہے تو برکت ضرور ہو گی۔ خدا بھی صرف نیت کو دیکھتا ہے۔" اسی وجہ سے وہ صفائے قلب اور ضمیر کی بیداری کو اچھا سمجھتے تھے۔ انکا مقولہ تھا کہ "نیک ہونا کچھ مشکل نہیں۔ نیکی صرف ضمیر کی پیروی کرنے سے مل سکتی ہے۔" To be good is to be in harmony with one's own conscience.

مذہبی عقائد:- مرحوم صوم و صلوٰۃ کے پابند نہ تھے۔ لیکن تازہ غسل کے بعد اکثر نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ نماز کے وقت مرحوم مجسم تصویر عبودیت معلوم ہوتے تھے۔ ہمیشہ چھُپ کر نماز پڑھتے تھے اور نماز کے علاوہ جب اُن کا جی چاہتا تھا سجدے میں گر کر دعا مانگا کرتے تھے۔ اُن کی دعا بہت مُوثر ہوتی تھی۔ آٹھ یا دس سال کا ذکر ہے۔ ایک بزرگ کہیں باہر سے تشریف لائے اور فرمایا کہ "میں آج کل پریشانی میں مبتلا ہوں۔ خواب میں بشارت ہوئی کہ دلّی میں ایک ناصر علی ہے اُس سے دعا کے لئے کہہ" واللہ عالم یہ کہاں تک درست ہے کم از کم اُن بزرگ نے ظاہر تو یہی کیا تھا۔ بہت کم دعا دیتے تھے۔ انتقال سے پانچ دن پہلے جب میں فرخ نگر سے مرحوم کی خیریت دریافت کرنے حاضر ہوا تو مرحوم کو

گھبراہٹ ہو رہی تھی اور بے اختیار رو رہے تھے۔ اتفاق سے جون کا ساقیؔ تازہ شائع ہوا تھا۔ میں نے اُس میں سے مرحوم کو مضمون سُنایا۔ بہت محظوظ ہوئے۔ فرمایا "تو نے اس وقت مجھے خوش کر دیا۔ خدا تجھے خوش رکھے!" عین انتقال کے روز میرے والد ماجد کو بھی یہی دعا دی تھی کہ خدا تجھے خوش رکھے۔

اُصولاً مرحوم کا مذہب وہی ہونا چاہیئے تھا جو دُنیا کے بڑے بڑے فلاسفروں کا رہا ہے۔ یعنی دہریت۔ لامذہبیت یا فطرت پرستی۔ لیکن مرحوم کا ایمان یہ تھا کہ عقل کو عقیدہ میں دخل نہیں۔ عقیدہ کے معاملے میں انسان جتنی جہالت اور لاعلمی سے کام لے اُتنی ہی راسخ الاعتقادی پیدا ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے یہ امر متنازعہ فیہ ہو۔ لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک اسلام کا تعلق تکمیل اخلاق۔ درستیٔ اعمال اور ضمیر کی بیداری سے ہے مرحوم سچے مسلمان تھے فروعات کی پابندی مرحوم کے نزدیک لازمۂ مذہب نہیں تھی۔ خدا سے اُنہیں سچی عقیدت تھی اور اُسی کو اپنا معبودِ حقیقی تصوّر کرتے تھے۔

اپنے والدِ مرحوم سے عقیدت:- میر صاحب مرحوم کو اپنے والد ماجد مولوی ابو المنصور سے عقیدت خاص تھی اُن کی خوشنودی کو اپنے لئے باعثِ نجاتِ دارین خیال کرتے تھے۔ اس کا ثبوت مرحوم کے اس خط سے مل سکتا ہے جو اُنہوں نے میرے والد ماجد کو لکھا تھا:-

"برخوردار من۔

اب کی دفعہ میری بیماری سے تمہیں بہت زیادہ فکر ہوا اور میں بھی کچھ کچھ آثار سفرِ آخرت کے دیکھ رہا تھا۔ بارے تمہاری پریشانی خدا نے دیکھ لی اور میں نے بھی ابھی چند روز زندہ رہنے کا ارادہ کر لیا اور خدا نے اپنا فضل کیا۔ جبکہ تمہیں میری وجہ سے اسقدر پریشانی ہوئی تو مجھے چاہیئے کہ خدا کے فضل کا بھی ذکر کروں تاکہ تم خوش ہو۔

بڑھاپے کی وجہ سے اب کے بیماری میں زیادہ اندیشہ رہا اور خاصکر اس وجہ سے کہ بیماری زیادہ ٹھہری اور ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری شکایت ہو گئی۔ دو ڈھائی مہینے تو برابر سست آئے اور آخر میں نزلہ و زکام ہو گیا۔ نزلہ میں ذرا معمول سے زیادہ تکلیف ہوئی۔ اس تکلیف میں دو دفعہ رات کو تمہاری بی بی اور عورتوں کو جگایا۔ اور ایک دفعہ رات کو گھبرا کر نیچے چلا گیا۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ مر رہا ہوں اور والد ماجد مرحوم نے مجھے زمین پر سے اُٹھا کر گود میں لیا اور زبان مبارک سے فرمایا کہ

"افسوس! کیسا اچھا لڑکا مر رہا ہے!"

یہ آواز میرے کان میں صاف صاف آئی اور ابھی وہ مجھے سنبھالے ہوئے تھے کہ میری آنکھ کُھل گئی۔ میں گھبرا کر نیچے گیا اور یہ خواب سب عورتوں سے بیان کیا۔ میں نے کبھی والد ماجد کو اپنی طرف سے اس قدر خوش نہیں دیکھا تھا۔ باپ کا خوش ہونا میری نگاہ میں ہزار بہشت اور لاکھ نعمت سے بہتر ہے۔ جس محبت اور پرورش و الطاف سے میں نے اُن کی زبان سے یہ لفظ سُنے ہیں قیامت تک نہیں بھولنے کا۔

قیامت میں یہی لفظ میری نجات کا ذریعہ ہوں گے۔ اب مجھے کامل یقین ہے کہ دین و دُنیا میں میرا بیڑا پار ہوگیا۔ دین کا ثبوت دیکھ لو کہ جس کا باپ بیٹے سے خوش ہو اُس کی خوش نصیبی میں کیا شک ہے۔ رہا دُنیا کا معاملہ یہ بھی میرے باپ کے صدقے میں ایسا گذرا کہ خدا سب کو نصیب کرے۔ اب میں خوش ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ خوش ہو۔ خوشی کے اظہار میں میں ایک روپیہ تمہیں اپنے خواب کی یادگار بھیجتا ہوں۔ میں بالکل خوش ہوں۔

تم اِس خط کو رکھ چھوڑنا تاکہ میرے اعتقاد کا گواہ رہے۔"

یہ لائقِ تقلید عقیدتمندی میرے والد ماجد کو ورثہ میں ملی۔ موصوف کو بھی مرحوم سے اتنی عقیدت تھی اور ہے کہ اس دورِ ترقی و انقلابات میں اس کی مثل ملنی ناممکن ہے۔ ہر نئی بات کرنے سے پہلے موصوف اُن سے اجازت طلب کرتے اور ہر بات میں حتی المقدور اُن کا تتبع کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اس عقیدت نے یہاں تک ترقی کی کہ "پدر پرستی" کہلائی جانے لگی۔

خدا ہمیں اس کی توفیق عطا کرے کہ ہم بھی اس لائقِ فخر خاندانی روایت کو برقرار رکھ سکیں۔

خط و کتابت:- مراسلت اُن کی زندگی کا اہم جزو تھی۔ خود بھی پابندی سے خط لکھتے تھے اور دوسروں کے خطوں کے جواب بھی نہایت باقاعدگی سے دیتے تھے۔ خطوں کا جواب نہ دینا اُنکے نزدیک ایک ناقابلِ معافی اخلاقی جُرم تھا جس کے وہ کبھی مرتکب نہیں ہوئے۔ دورانِ ملازمت میں سرکاری خط و کتابت کے علاوہ حکّام سے نجی تعلقات کی بنا پر سلسلۂ رسل و رسائل جاری رہتا تھا۔ صلائے عام کی ڈاک کے بھی نہایت التزام سے خود ہی جوابات لکھتے تھے۔ ریاض خیر آبادی۔ دلگیر اکبر آبادی۔ نیاز فتحپوری۔ محمد سبحان اللہ گورکھپوری مرزا عرفان علی بیگ مرحوم۔ مہدی حسن مرحوم سے خاص طور پر رسمِ مراسلت تھی۔ سر جان ٹامسن صاحب (سابق چیف کمشنر دہلی) سے خاص دوستانہ تعلقات تھے اور خوب خط و کتابت ہوتی تھی۔ صاحب موصوف کے ولایت چلے جانے پر بھی سلسلۂ مراسلت جاری رہا۔ چنانچہ وفات سے دس پندرہ دن پہلے جب صاحب موصوف کے رام پور آنیکی افواہ تھی مرحوم نے اُنہیں خط لکھا۔

اقربا میں میرے والد ماجد کے سوا کسی سے خط و کتابت نہیں تھی۔ اُنکے خطوں کا بیچینی سے انتظار کرتے تھے۔ اگر خلافِ معمول دیر ہو جاتی تو پریشان ہوتے۔ بار بار میری والدہ سے پوچھتے "انتصار کا کوئی خط نہیں آیا تمہارے خیال میں کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" اگر دو ایک دن اور خط نہ آتا تو بذریعہ تار خیریت طلب کرتے۔ (No news is good news) کے وہ قائل نہیں تھے۔

ڈاک عموماً زیادہ ہوتی تھی۔ اخبار رسالے۔ خطوط اور دُکانوں کی فہرستیں وغیرہ کثیر تعداد میں برابر آتی رہتیں۔ ضعفِ بصارت کے سبب آپ نہیں لکھ سکتے تھے تو مجھ سے لکھواتے تھے یا کرم الٰہی صاحب سے، خود بولتے جاتے تھے اور مصر ہوتے تھے کہ میرے ہی الفاظ لکھو۔ خطوط کا انداز خاص ہوتا تھا۔ القاب نہایت مختصر،

میرے والد ماجد کو صرف "بیٹا!" یا "برخوردار من" لکھتے تھے اور احباب کو زیادہ تر "جناب من"، "یا کرم فرمائے بندہ" سے خطاب کرتے تھے۔ عبارت سلیس، موثر اور زوائد سے پاک ہوتی تھی اور گو روزمرہ کی بول چال ہوتی تھی، لیکن وہ بھی اُن کے مخصوص رنگ میں اس درجہ ڈوبی ہوتی تھی کہ اُنکے خطوط فوراً پہچانے جاسکتے ہیں۔

میرے والد ماجد کو انگریزی میں بھی خط لکھتے تھے۔ لیکن کم۔ اکثر خطوں میں پیراگراف انگریزی میں ہوتے تھے۔ بعض خطوں میں آدھی اُردو آدھی انگریزی ہوتی تھی۔ لیکن احباب میں سے کسی کو انگریزی میں خط نہیں لکھے۔ انگریز دوستوں کو بھی زیادہ تر اُردو ہی میں لکھتے تھے۔ میرے والد ماجد کے نام مرحوم کے جتنے خط ہیں وہ اِس لحاظ سے زیادہ قیمتی ہیں کہ مرحوم کے صادق جذبات اور کیفیت دماغ کے سچے عکس ہیں۔ جو سمجھ میں آتا اور جو دل میں ہوتا مکر و ریا سے پاک الفاظ میں لکھدیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک خط پیش کرتا ہوں:-

"بیٹا!

تم خط لکھنے میں مجھ سے زیادہ گنہگار رہو کہ بہت دنوں میں لکھتے ہو اور میں تم سے باتیں کرنے کا بہانہ ڈھونڈا کرتا ہوں۔ میں اِن دنوں فلاسفی کی کتابیں زیادہ پڑھتا ہوں ایک کتاب جس میں ۶۰ برس سے ۹۰ برس کی عمر تک زندگی بسر کرنیکی تدبیریں درج ہیں بہت دلچسپ ہے۔ سب سے پہلی نصیحت یہ ہے اِسے تم بھی یاد رکھنا۔ (It is a great sin to die rich) ساٹھ برس کے بعد کسی معاملے میں جو خانگی ہو دخل نہ دیا جائے۔ یہ باتیں بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں:-

"Solitude is more suitable than society in old age. When you reach sixty, turn over a new leaf and if you were careless of your appearance before, begin to dress well and live well. It makes you feel better. Keep some hobby. From sixty to ninety do not attend funerals, for the funeral of another is sometimes followed by your own. Do not attend marriages and other social & public occasions; they worry you and worry shortens the life."

اُن کے خطوط ادبی حیثیت سے بہت قیمتی ہیں۔ چنانچہ میرا ارادہ ہے کہ مقامات ناصری کے ساتھ ہی مکاتیب ناصری بھی مرتب کروں جس سے اُردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہوگا۔ میرے والد ماجد کے پاس

تمام خطوط باحتیاط محفوظ ہیں۔ لیکن اُن میں زیادہ تر خانگی حالات ہیں۔ کاٹ چھانٹ کے بعد بہت قلیل سامواد فراہم ہوسکتا ہے اس لئے مرحوم کے احباب سے استدعا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں میری معاونت کریں اور بغرض استفادہ مجھے اُن کے خطوط کی نقل بھیجدیں۔

کُتب بینی: کُتب بینی مرحوم کے لئے شرطِ حیات تھی۔ افکارِ زمانہ سے جتنا وقت بچتا وہ کتابوں کی نظر ہوتا۔ پڑھنے کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ بڑی سے بڑی کتاب کو ایک نشست میں ختم کردیتے تھے۔ پھر اُسی کتاب کو دوبارہ پڑھتے تھے۔ اور جابجا سُرخ پنسل سے نشان لگاتے جاتے تھے اور کہیں کہیں حاشیے پر کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے تھے۔ عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی ادب سے خاص شغف تھا۔ اِسی وجہ سے آپ کے کُتب خانے میں زیادہ کتابیں انگریزی کی رہتی تھیں۔ مرحوم کے محبوب مضامین تاریخ۔ فلسفہ و مذہب ادبیات۔ مزاح اور انتقادات عالیہ تھے۔ تاریخ میں آپ کو تاریخ ہند سے خاص دلچسپی تھی۔ اور تاریخ ہند میں بھی خصوصیت کے ساتھ مغلوں کا زمانہ۔ تاریخ غدر بھی مرحوم کا مرغوب ترین مضمون تھا، چنانچہ فارسی اور انگریزی کی جس قدر کتابیں اِن دو مضامین پر آپ کی نظر سے گذریں وہ شاید ہی کسی اور کے مطالعہ میں آئی ہوں۔ علاوہ ازیں تاریخ الاسلام کا بھی آپ نے غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ عربوں کے زمانۂ جہالت سے لیکر خلفائے راشدین اور اُس کے بعد تک کے حالات سے مرحوم کو کماحقہٗ واقفیت تھی۔ مجھے یاد ہے مرحوم اکثر حیدر مرزا صاحب سے واقعہ کربلا پر مباحثہ کیا کرتے تھے۔ فلسفہ میں مرحوم کو مابعد الطبیعاتی مسائل سے خاص لگاؤ تھا۔ بڑے بڑے یونانی فلاسفروں کی تصنیفات کے علاوہ جدید یورپین مفکرین کی کتابیں بھی آپکے پیشِ نظر رہتی تھیں۔ مذہب میں تاریخ الاسلام اور عیسائی مذہب سے خاص شغف تھا۔ حدیث و فقہ اور دینیات پر عبورِ تامہ تھا۔ عیسائی مذہب کے متعلق گو ہزاروں پُرمغز تصنیفات آپ کی نظر سے گذریں، لیکن ذاتی عقائد میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ ادبیات میں عربی فارسی اور انگریزی کلاسیکس کے علاوہ بیسویں صدی کے یورپین مصنفین کی بے شمار تصانیف ہر وقت آپ کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ انگریزی نظم کو مرحوم نے کبھی پسند نہ کیا یوں ورڈسورتھ ملٹن۔ براؤننگ۔ ٹینی سن۔ بائرن۔ کیٹس۔ شیلے۔ کولرج وغیرہ کی دل سے قدر کرتے تھے مگر یہ اُن کا ایمان تھا کہ نظم میں ہمارے مقابلے پر کوئی نہیں آسکتا۔ ملٹن کی (Paradise Lost) (فردوسِ گم گشتہ) ایک طرف اور ظہوری کا ساقی نامہ ایک طرف۔ البتہ انگریزی نثر کے دل سے مداح تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "اِن لوگوں نے نثر کو عرش تک پہونچادیا۔ ناممکن ہے کہ ان جیسی نثر کوئی لکھ سکے" مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ شاید ہی کسی انگریز مصنف کی کوئی کتاب اُن کی نظر سے بچی ہو۔ اور حیرت ہوتی ہے یہ دیکھکر کہ کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس پر سُرخ پنسل کے نشان اور حاشیے نہ ہوں۔ گولڈسمتھ۔ ڈاکٹر جانسن۔ میریڈتھ۔ ٹھیکرے۔ ایڈیسن۔ آسکر وائلڈ بالزک اور والٹیر کے قدردان تھے۔ بلکہ جہاں تک متشائم جذبات کا تعلق ہے آسکر وائلڈ اور بالزک نے تو آپ کے دماغی رجحان پر اپنا تسلط ایسا جمایا کہ آپ کے مضامین میں جابجا اُن کی فلاسفی کا تذکرہ ہے۔

بلکہ بعض مضامین تو انہی کے تتبع میں لکھے گئے ہیں۔ اس سبب سے میر صاحب مرحوم کا طرزِ غور و فکر (mode of thinking) انگریزی علماء سے مشابہ ہے۔ اُن کے کلاسیکل لٹریچر کا خاصّہ طبعی یہی ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کے مغربی فلسفیانہ مسائل کو اپنے خالص مشرقی اسلوبِ تحریر میں اس خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مابعد الطبیعاتی مسائل صرف عام فہم ہی نہیں بلکہ سہل ممتنع بن جاتے ہیں۔ موجودہ مصنفین میں سے برنارڈ شا کو بھی آپ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مزاح میں مرحوم کو "لنڈن پنچ" سب سے زیادہ عزیز تھا۔ ڈکنز کے عاشق تھے۔ چارلس لیمب اور لے ہنٹ کی بھی تمام کتابیں آپ کی نظر سے گذریں۔ پی۔ جی۔ ووڈ ہاؤس اور جی۔ کے چسٹرٹن کو بھی پسند کرتے تھے۔ اُردو میں سنجیدہ ظرافت نام کو نہیں اور جو ہے وہ اس لائق نہیں کہ اُس کو صحیح مزاح نگاری کہا جائے۔ جان صاحب رنگین اور انشا کی ریختی بھی پسند تھی۔ انگریزی رسائل میں Nineteenth Century، Strand، Daily، Happy اور Islamic Rev: خاص طور سے عزیز تھے۔
اُن کا کتب خانہ آج ہندوستان کے بہترین کتب خانوں میں سے ہوتا۔ مگر افسوس اِنا قدر شناس لوگوں کے نامساعد ہاتھوں سب برباد ہوا۔ مشکل سے تین یا چار ہزار کتابیں باقی ہوں گے اور وہ بھی معمولی قسم کی۔ بیش قیمت قلمی کتابوں میں سے ایک نہ رہی۔ ہمارے سنِ شعور کو پہونچنے تک سب کچھ برباد ہو چکا تھا۔
اِس موقعہ پر مرحوم کے ایک خط کا اقتباس درج کرنا نامناسب نہ ہوگا:۔
"بیٹا!"

"......میری ایک آرزو یہ ہے کہ کتب خانے والا مکان تکلف سے آراستہ ہو جائے۔ اور میں دن رات وہیں پڑا رہوں۔ تم اگر ساتھ چا پینے آجاؤ تو کیا کہنا۔ مگر کوئی معمولی ذکر کسی کا نہ ہو۔ کھانا جب مجھے بھوک لگے پکا پکایا مل جائے اور کوئی لڑکی آ کر کھلا جائے۔ کوئی نایاب کتاب یا چیز نظر آئے تو مجھے اتنا مقدور ہو کہ فوراً خرید لوں۔ رات کو بے فکر سوؤں اور صبح خوش اٹھوں۔ کوئی مسئلہ فلاسفی کا جو سمجھ میں نہ آتا ہو اُسے سمجھ لوں اور دوسروں کو سمجھا سکوں۔ دُنیا کی جتنی کتابیں دل و دماغ کو خوش کر سکیں سب میرے پاس ہوں۔ جاڑے میں انگیٹھی ہو اور گرمی میں برف۔ برسات میں کمرے کے اندر بیٹھا ہوں اور وہ ٹپکتا نہ ہو۔ رات کو جلانے کیواسطے خوبصورت Candlestick کی روشنی ہو اور جو کتاب مجھے پسند ہو وہ میرے سامنے ہو۔ تم اتنا سامان میرے لئے کر دو تو I will die happy ——

نوادر سے دلچسپی:۔ خوبی یا عیب جو کچھ بھی ہو مگر میر صاحب مرحوم کی صرف یہی ایک (hobby) تھی کہ وہ عجیب و غریب اور نادر الوجود چیزیں جمع کیا کرتے تھے۔ مرحوم نے اپنے اس شوق کو اس وضعداری سے نبھایا کہ آخری مرتبہ بھی جب چوک تشریف لے گئے تو ایک قلمدان پچی کاری کا لائے آپ کی پنشن کا بیش ترین حصّہ اسی شوق کی نذر ہوتا تھا۔ کباڑیئے بڑی تلاش کے بعد طرح طرح کی چیزیں لایا کرتے

تھے اور مُنہ مانگی قیمت پاتے تھے۔ مرحوم روزانہ جامع مسجد تشریف لے جاتے تھے اور وہاں بھی کباڑیئے بُری طرح پیچھے پڑتے تھے اور مرحوم ہر ایک سے کچھ نہ کچھ خرید لیا کرتے تھے۔ قلمی تصاویر۔ قطعات اور دستکاری کے اعلیٰ نمونوں کا ایک گرانقدر ذخیرہ مرحوم کے پاس جمع ہو گیا تھا۔ اور کُتب خانے ہی کا ایک حصّہ عجائب خانے کے نام سے موسوم تھا۔ ایسی ایسی نایاب قلمی تصاویر مرحوم کے پاس محفوظ تھیں کہ اُن کی قیمت کا بھی صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ بڑے کمرے میں ایک تصویر آویزاں تھی۔ جسے میں اپنے بچپن میں بڑی حیرت سے دیکھا کرتا تھا۔ یہ تصویر نورجہاں کے دربار کی تھی جس میں سر تا سر طلائی نقش و نگار بنے ہوئے تھے [illegible] Art [illegible] میں (جس کے انتظام میں مرحوم بھی شریک تھے) جب اُس تصویر کو رکھا گیا تو نوسو روپے اُس کی قیمت قرار پائی۔ غرض ایسی ہی بیش قیمت اور نادر الوجود اشیا کا ایک بیش بہا ذخیرہ مرحوم کے پاس باحتیاط محفوظ تھا جس میں روزانہ اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا۔ یہ ذخیرہ مرحوم کو اتنا عزیز تھا کہ کسی کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتے تھے۔ حتیٰ کہ میرے والد ماجد کو بھی اجازت نہیں تھی کہ وہ کسی چیز کو اِدھر سے اُدھر رکھ سکیں۔ جب یہ ذخیرہ بڑھتا گیا تو بالاجانے کا بڑا کمرہ بھی عجائب خانہ بن گیا۔ مگر یہ ہر وقت مقفل رہتا تھا اور کسی کو اجازت نہ تھی کہ اُس میں جا سکے۔ میرے والد ماجد نے کئی مرتبہ اصرار سے کہا کہ سفیدی کروا دیجئے مگر مرحوم نے اجازت نہ دی۔

ملک معظم کی خدمتِ عالی میں شرف باریابی:۔ میر صاحب مرحوم کو صرف نوادر جمع کرنے کا شوق ہی نہ تھا بلکہ مرحوم فنونِ لطیفہ کے جیّد نقاد بھی تھے۔ آرٹ کو اچھی طرح سمجھتے تھے مصوری کے حسن و قبح کے پرکھنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۲ء میں دربار کے موقع پر جب قلعہ معلیٰ کے عجائب خانے کی تنظیم و ترتیب ہوئی تو مرحوم اُس کے انتظام میں شریک کئے گئے اور اسی سلسلہ میں مرحوم کو ملک معظم شہنشاہِ جارج پنجم کی بارگاہِ سلطانی میں پیش ہونے کا شرف عطا ہوا اور ملک معظم سے مصافحہ کرنے کی عزت حاصل ہوئی۔

حافظہ:۔ حافظہ اتنا عمدہ تھا کہ برسوں کی بات نہیں بھولتے تھے۔ یہی حال لکھنے پڑھنے میں تھا۔ جو کچھ ایک مرتبہ قلم سے نکل جاتا وہ ایک زمانے تک یاد رہتا تھا۔ تواتر مطالعہ سے اکثر کتابوں کے بیشتر حصے حفظ ہو گئے تھے غالب کا دیوانِ اُردو نوک برزبان تھا۔ گلستاں بوستاں اور شاہنامہ آدھے سے زیادہ یاد تھا۔ ستّر برس کے بعد انسان عموماً سترہ بہترہ کہلایا جاتا ہے لیکن میر صاحب مرحوم کی دماغی حالت میں آخر وقت تک سرمو فرق نہ آیا۔ اُن کی ذہانت اور برجستہ گوئی کا وہی عالم تھا۔ عین انتقال والے دن جبکہ حد درجہ نقاہت کے سبب مرحوم آنکھ بھی نہ کھول سکتے تھے۔ یہ واقعہ پیش آیا۔ اتفاق سے آئس کریم والے نے آواز دی۔ میرے والد ماجد نے مرحوم سے کہا "آپ آئس کریم کھائیں گے؟" مرحوم نے ہاتھ سے نفی کا اشارہ کیا۔ میرے والد ماجد نے کہا "کھا لیجئے آپ تو بہت شوق سے کھاتے تھے" مرحوم نے نحیف آواز میں کہا۔ ع

"وہ بات کو کہن کی گئی کو کہن کے ساتھ"

اس سے ایکدن پہلے کا واقعہ ہے کہ مرحوم کو گھبراہٹ ہو رہی تھی ہم سب جمع تھے، میرے والد ماجد نے کہا۔ "دیکھیئے ہم سب آپ کی خدمت کتنی نیک نیتی سے کر رہے ہیں۔ یقین ہے کہ خدا اپنا فضل کریگا اور آپ ضرور اچھے ہو جائیں گے۔" مرحوم نے کہا۔ ع "ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کرے۔"

متفرق اشعار کا ایک بیکراں ذخیرہ مرحوم کے دماغ میں محفوظ تھا۔ اتنے اشعار یاد تھے کہ شاید کسی اور کو نہ ہوں اور کیا مجال جو کبھی کسی شعر کے ادا کرنے میں اضافت کی بھی غلطی ہو یا غلط مصرعے پڑھیں۔ صرف شعر یاد رکھنا ہی کمال نہیں ہے بلکہ اُن کا حسب موقعہ استعمال ایک ایسی چیز ہے جس میں میر صاحب مرحوم کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ اُن کے لٹریچر پر نظر ڈالیئے ایسے اشعار صرف دو چار ملیں گے جو ایکدفعہ سے زیادہ لکھے گئے ہوں۔ ہر مرتبہ نیا شعر لکھتے تھے۔ اُردو میں خواجہ میر درد اور ان سے بھی پہلے کے شاعروں سے لے کر جوش، جگر اور مائل تک سب کے دواوین اُن کی نظر میں تھے اور ہر ایک کے بہت سے اشعار اُن کو حفظ تھے۔ اسی سے اُن کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہی حال فارسی میں بھی تھا۔ رودکی سے لے کر بیسویں صدی کے جدید شاعروں تک سب سے واقف تھے۔

بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی:- مرحوم انتہا درجہ کے زندہ دل واقع ہوئے تھے۔ اُن کے لٹریچر میں بھی ظرافت کا عنصر غالب ہے۔ جسکو نمایاں کرنے کے لئے ایک مستقل مقالہ درکار ہے۔ فی الحال اُن کی روزمرہ کی زندگی سے بحث ہے اُن کی طبیعت میں ظرافت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی، دوران چار میں لطائف سُنا سُنا کر سبکو ہنساتے رہتے تھے۔ اُن کی سُنائی ہوئی بے شمار نقلیں مجھے یاد ہیں جن کو قلم بند کرنے کے لئے ایک عمر چاہیئے۔ خطوط میں بھی یہ انداز بدرجۂ اتم موجود ہے۔ چنانچہ میرے والد ماجد کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"........ لڑکیوں کے خطوط لڑکیوں کو دے دیئے۔ دونوں لڑکیاں بہت خوش ہوئیں۔ خاص کر ہماری نئی بیٹی جو تمہارے اچھے ہو جانیکی خوشی میں بہت زیادہ منہ پھیلا رہی ہیں۔ یہ نئی بیٹی تم سے تو علیحدہ جو مل جائے چھوڑینگی نہیں اسکے بعد مجھ سے بھی دعویٰ ہے کہ بُڈھے دادا سے بھی کچھ لینا چاہیئے۔ لقد میں مجھے تامل ہے ۔ گر جاں طلبی مضائقہ نیست گر زر طلبی سُخن دریں ست۔
مگر میں تو کسی نہ کسی طرح باتیں بنا کر راضی کرلوں گا تم کو پیچھا چھٹنا مشکل ہوگا۔"

پاٹودی سے واپسی پر دلچسپی کے لئے "شب مہتاب" منایا کرتے تھے۔ جس کی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ رات کا کھانا کھانیکے بعد سب چھت پر جمع ہو جاتے۔ سفید چاندنی بچھی ہوتی اور اُس پر قالین، گاؤ تکیہ وغیرہ اور یہاں کبھی چاء کبھی کافی پی جاتی۔ مرحوم لطائف اور نقلیں بیان کر کر کے سبکو ہنساتے اور گھنٹے دو گھنٹے کے بعد یہ مجمع ہنسی خوشی برخاست ہوتا۔ اس کے بعد "دیوالی" منائی جاتی جس کے لئے میری چھوٹی بہن کو "لچھمی" بنایا جاتا۔ بہت سے چراغ جلتے "لچھمی جی" آتیں اور سب اُن کو ڈنڈوت کرتے۔ غرض مرحوم کے دم سے اِس قسم کی

پُرلطف صحبتیں اکثر ظہور میں آتیں۔ اب تو یہ سب کچھ ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں مرحوم کو اپنی جوبلی منانے کا اشتیاق تھا۔ افسوس! یہ حسرت پوری نہ ہو سکی۔ خدا معلوم اُس کے انعقاد کے لئے کیا کیا اہتمام ہوتے مرحوم نے میرے والد ماجد کو اکثر اس کے متعلق لکھا۔

"......... اب مجھے اپنی جوبلی کا فکر ہو رہا ہے کہ اب کی دفعہ میری اس لمبی عمر کی خوشی منانی چاہیئے کہ اس خاندان میں مجھ سے بڑا کوئی نہیں۔ وحدہٗ لاشریک لہٗ تمہاری والدہ کے انتقال کے بعد سے ہو گیا تھا کہ کوئی گلے کا ہار نہیں اور اب اس طویل عمر سے جلّ جلالہٗ کا رتبہ حاصل ہو گیا کہ کوئی مجھ سے بڑا نہیں، اِس لئے میں جوبلی کا مستحق ہوں"

معظمہ دادی اماں صاحبہ کی وفات:-

معظمہ دادی اماں صاحبہ کا انتقال ۱۹۱۵ء میں اوائلِ محرّم میں ہوا۔ میر صاحب مرحوم کو خاص طور سے اور تمام متعلقین کو عام طور سے جتنا صدمہ ہوا اُس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ مرحومہ اپنی ضعیفی کے باوجود سارے گھر کو سنبھالے ہوئی تھیں۔ فی زمانہ مرحومہ جیسی نیک طبیعت۔ صاف باطن اور خوش خصال عورت کا ملنا ناممکن ہے۔ وہ ایک عفت مآب، اطاعت گذار بیوی۔ ایک شفیق اور چاہنے والی ماں اور ایک لائق پرستش انسان تھیں۔ مرحومہ ہی کے دم سے ہمارے گھر اور ہمارے خاندان کی رونق تھی۔ اب وہ نہیں ہیں تو افراتفری برپا ہے۔ میر صاحب مرحوم کو مرحومہ سے اتنی اُلفت تھی کہ اکثر مرحومہ کو یاد کر کے رو یا کرتے تھے۔ اُن کے انتقال کے کچھ ہی عرصہ بعد میر صاحب مرحوم کے احباب نے اصرار کیا کہ وہ دوسرا نکاح کر لیں۔ لیکن مرحوم نے قطعی انکار کر دیا اور محرک صاحبان پر بہت خفا ہوئے۔ میرے والد ماجد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"برخوردار من!

یہ تمہاری لئے درست ہے کہ تمہاری والدہ کے گذر جانے سے مجھے (Mental) تکلیفیں بہت زیادہ ہو گئیں۔ اور بڑھاپے میں جسمانی کمزوری تو لازمی ہے۔ اس کا علاج میں نے Morally کیا کہ احباب نے رائے دی اور تقاضہ کیا مگر میں نے دوبارہ نکاح سے قطعی انکار کر دیا۔ اُس کا فائدہ خاندان کو ہوا۔ گو مجھے بے آرامی ہے۔ لیکن گھر والوں کو میری وجہ سے کسی قسم کی تکلیف نہیں اور اس احساس سے میں بہت خوش ہوں۔ تمہیں جو میری وجہ سے فکر اور دردِ سر ہوتا ہے یہ تمہاری سعادتمندی کا تقاضہ ہے۔ گو تمہاری عمر کم ہے۔ مگر زندگی کا مدار (feelings) پر ہے۔ اس وقت یہ غنیمت ہے کہ میں زندہ ہوں تمہاری ماں کو جتنا تمہارا خیال تھا وہ تو مجھ سے ممکن نہیں مگر مجھے بھی تمہاری نیک بختی اور سعادتمندی کی وجہ سے تمہارے ساتھ محبت یعنی (reciprocal feelings) کا اثر ہے۔ مگر میں چراغِ سحری ہوں اور چراغِ سحری کو رات کی فکر کرنی غلطی ہے

رات جتنی بھی جس طرح ہوا گذر گئی اب صبح کے چراغ کے لئے بجھنے کے سوا اور کیا باقی ہے۔ دُنیا میں آرام کی تمنا نہیں اور نہ اُمید ہے صرف مجھے اپنے طور پر جی لینے دو۔ چند روز میری زندگی کے باقی ہیں میں نہیں چاہتا کسی وجہ سے رنجیدہ ہوں۔ میں اپنا رونا رو چکا اب تم جانو اور تمہارا کام۔ مگر دیکھو خدا کو نہ بھولنا۔ اُس نے بڑی بڑی مصیبتوں میں تم کو بچا لیا۔ خدا حافظ!

اولاد:- میر صاحب مرحوم کے چار لڑکے اور سات لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکی دو مہینے کی ہو کر ہٹ گئی۔ دوسری لڑکی نے ۱۳ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ تیسری لڑکی عین شباب میں رُخصت ہوئی جن کی دو نشانیاں ہیں۔ واصف الرحمٰن اور ہاتف الرحمٰن۔ سنجھلی لڑکی نے ۲۷ء میں رحلت کی مرحومہ کی تین اولاد ہیں۔ ایک لڑکی اور دو لڑکے۔ تنصیر علی مرحوم سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور ضلع روہتک میں اُوور سیر تھے عین جوانی میں بتاریخ ۸ اگست ۱۹۱۲ء یہ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ "ایں ماتمِ سخت است کہ گویند جواں مرد"۔ منتصر علی مرحوم میرے والد ماجد سے بڑے تھے۔ ریلوے میں ملازم تھے۔ یہ بیچارے بھی قریب ۴۵ برس کی عمر میں ۲۰ ستمبر ۱۹۲۰ء کو راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ مرحوم لاولد تھے۔ اب میر صاحب کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ تینوں لڑکیاں بفضلہٖ اپنے اپنے گھر خوش ہیں۔

سید نصیر علی صاحب اُن کے بڑے لڑکے ۱۸۹۴ء میں محکمۂ نمک میں ملازم ہوئے اور ۱۹۰۲ء میں بوجوہ مستعفی ہو گئے۔ .... اس کے بعد وہ ڈپٹی کمشنر گوڑ گانوہ کے ریڈر و کلرک رہے۔ یہاں سے بھی وہ تین سال کے بعد علیحدہ ہو گئے۔ ۱۹۱۳ء میں وہ ریاست اورچھہ میں بعہدہ اسسٹنٹ فارین سکریٹری ملازم ہو گئے۔ لیکن ایک ہی سال بعد بوجہ طویل علالت کے یہاں سے بھی مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد وہ گھر ہی پر رہے، "صلائے عام" کے اجراء کا انتظام آپ ہی کے سپردگی میں رہا۔ اب اُن کی عمر ساٹھ برس کی ہے لیکن قوے بفضلہ درست ہیں۔ سید انتصار علی صاحب (میرے والد ماجد) میر صاحب مرحوم کی طرح (self-made) انسان ہیں۔ اپنی نو عمری ہی کے زمانے میں موصوف کے دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا تھا کہ کسی طرح بھی اپنے وجود کو والد ماجد مرحوم کے لئے بار نہ بنانا چاہیئے۔ چنانچہ اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی سے اپنی تعلیم سے فراغت پاتے ہی موصوف کو معاش کی فکر دامنگیر ہوئی۔ میر صاحب مرحوم، موصوف کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے موصوف کا باہر جانا پسند نہ کیا۔ لیکن موصوف کسی نہ کسی طرح اپنے والد کی بغیر اجازت ۱۹۰۲ء میں اجمیر چلے گئے۔ اور وہاں آڈٹ آفس میں کلرک مقرر کر لئے گئے۔ اُس وقت موصوف کی عمر صرف ۱۶ برس کی تھی گو ملازمت مِل چکی تھی۔ لیکن موصوف کو اطمینان نہ تھا۔ اس لئے مختلف مقامات پر درخواستیں بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ مگر کسی درخواست میں بھی "ابنِ فلاں" کا ذکر نہ کیا۔ اسی سے موصوف کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ "ابنِ فلاں" کا اظہار کرتے اور موجودہ روش کے مطابق سفارشوں کو اپنے لئے مشعلِ راہ بناتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اُن کو باعزت عہدہ نہ مِل جاتا۔ اس لئے کہ اس زمانے میں پڑھے لکھے آدمیوں

کی کمی تھی، دوسرے یہ کہ اگلے وقتوں میں آجکل کی طرح ہر کہ ومہ کو رتبہ نہیں دیا جاتا تھا۔ بلکہ خاندان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ لیکن موصوف نے اِس قِسم کے ذرائع استعمال کرنا اور خاندانی ڈینگیں مارنا اپنے لئے ننگ سمجھا۔ کچھ عرصے بعد مونگھیر صوبہ بہار میں محکمۂ نمک میں ایک کلرک کی جگہ خالی ہوئی۔ موصوف نے درخواست دی اور مقرر کر لئے گئے۔ لیکن یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ کس خاندان سے ہیں۔ اسی زمانے میں میر صاحب مرحوم بھی محکمۂ نمک میں سپرنٹنڈنٹ تھے اور یہاں والد ماجد "ابنِ فلاں" کو پوشیدہ نہ رکھ سکے۔ لیکن پھر بھی موصوف نے اپنے والد ماجد کے نام اور رتبہ سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا۔ محض اپنی قابلیت۔ قوتِ بازو اور حُسنِ خدمات کی بدولت ترقی کرتے رہے۔ دو تین برس بعد میر صاحب مرحوم نے پنشن حاصل کر لی۔ میرے والد ماجد کلرک سے انسپکٹر بنے اور پھر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور اب اپنی ملازمت کے ۲۹ برس پورے کر چکے ہیں۔ اور آج کل فرخ نگر میں تعینات ہیں۔ فرخ نگر وہی جگہ ہے جہاں میر صاحب مرحوم خود ۲۰ برس تک رہ چکے ہیں۔ اور میرے والد ماجد کا بچپن اور جوانی بھی یہیں گذرا ہے۔ موصوف کی دلی تمنّا تھی کہ کسی طرح فرخ نگر آ جاؤں۔ میر صاحب مرحوم سے حُسنِ عقیدت کی بنا پر اُن کے نقشِ قدم پر چلنا اپنے لئے باعثِ صد فخر و مباہات خیال کرتے ہیں۔ میر صاحب مرحوم کو بھی موصوف کے فرخ نگر آ جانے سے بہت خوشی تھی۔ اس وجہ سے اور بھی خوشی تھی کہ یہ جگہ دہلی سے قریب ہے۔ اور میرے والد ماجد اُن سے ملنے کے لئے اکثر آتے جاتے رہینگے۔ میرے والد ماجد کی یہ تمنّا تھی کہ ایک دفعہ ضرور میر صاحب کو فرخ نگر لائیں۔ خدا نے یہ تمنّا بھی پوری کی۔ اور مرحوم انتہائی ضعیفی کے باوجود فرخ نگر گئے۔ اور وہاں جا کر بہت خوش ہوئے۔ جب کبھی میر صاحب اُن کی ترقی کو سراہتے تو وہ یہی عرض کرتے کہ "یہ سب کچھ آپ کی دعاء بزرگانہ کا طفیل ہے ورنہ میں تو وہی پندرہ روپے کا کلرک ہوں۔"

انشاپردازی کا شوق: میر صاحب مرحوم کو اوائل عمر سے انشاپردازی کا شوق تھا۔ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کا پہلا ادبی کارنامہ کیا ہے۔ سنہ ۱۶۶۸ء سے سنہ ۱۸۷۶ء تک اُن کے ادبی مشاغل معلوم نہیں ہو سکے صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ اُسی زمانے میں آپ نے علمِ کیمیا پر ایک کتاب لکھی تھی، جسکو گورنمنٹ عالیہ نے بہت پسند کیا اور سَو جلدیں خریدیں، یو۔ پی گورنمنٹ نے اُسکو نصاب میں داخل کر لیا۔ اور مبلغ تین سَو روپے بطور انعام عطا کئے۔ سنہ ۱۸۷۳ء میں آپ کو پنجاب یونیورسٹی کی ایگزنڈر فیلوشپ ملی۔

ابتدا ہی سے میر صاحب مرحوم کا خیال تھا کہ بلحاظ پاکیزہ بیانی اور نازک خیالی ہماری زبان کسی اور زبان سے کم نہیں ہے۔ نثر کی کمزوری کو وہ بھی محسوس کرتے تھے اور اس کمی کو پورا کرنے کی غرض سے وقتاً فوقتاً مختلف رسائل نکالتے رہے۔ اور برسوں کی محنت کے بعد نثر کو منشیانہ تصنّع اور مُقفّٰی مسجّع قید و بند سے

آزاد کر کے اُسے ایسی جلا کی اور ایسا لوچ پیدا کر دیا کہ اُس میں "گل و بلبل" کے علاوہ فلسفیانہ نکات بھی ادا ہو سکیں۔ اس مقصد میں وہ قطعی کامیاب ہوئے اس لئے کہ آج وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مضمون نگاری اور وقیع انشا پردازی کا جو سلیقہ اخباری دُنیا میں پھیلا یہ سب اسی ایک قلم کی آوازِ بازگشت ہے۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ اُن کے لٹریچر[1] اور موعظت، پر تنقید کی جائے نہ اتنا وقت کہ اُن کے محاسنِ ادبی کی داد دی جاسکے۔ یہ بھی مشکل ہے کہ ہر رسالے کی خوبیوں کو اُبھار کر دکھایا جائے۔ فی الحال میں ہر رسالے کے متعلق مختصر پیرایہ میں کچھ عرض کرونگا۔

تیرہویں صدی: سنہ ۱۸۶۶ء میں دفتر آگرہ اخبار۔ آگرہ سے جاری ہوا۔ اُسی زمانے میں سر سید علیہ رحمتہ "تہذیب الاخلاق" نکالتے تھے۔ میر صاحب مرحوم تیرہویں صدی میں سر سید علیہ رحمتہ کے رشحاتِ قلم پر تنقید کرتے تھے۔ "تہذیب الاخلاق" میں سر سید علیہ رحمتہ علانیہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کے عقائدِ مذہبی میں تاویل و ترمیم مناسب ہے۔ اس کے خلاف میر صاحب مرحوم نے "تیرہوں صدی" میں احتجاج کیا اور ایک حد تک کامیاب ہوئے عام طور سے کہا جاتا ہے کہ میر صاحب مرحوم سر سیّد علیہ رحمتہ کے مخالفین میں سے تھے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ سر سیّد علیہ رحمتہ کے مشن سے میر صاحب مرحوم کو کوئی تعرض نہ تھا وہ تو صرف اُن کے ادبی کارناموں کو کسوٹی پر کستے تھے۔ سر سیّد علیہ رحمتہ خود بدولت میر صاحب مرحوم کو "ناصح مشفق" کہتے تھے۔ اس بحث کے علاوہ "تیرہوں صدی" میں میر صاحب مرحوم نے خود بھی خوب دادِ سخن دی اور ایسے ایسے گراں قدر مضامین لکھے کہ سنجیدہ طبقہ "ناصر علی دہلوی" کا کلمہ پڑھنے لگا۔ "تیرہویں صدی" میں جو لٹریچر میر صاحب مرحوم نے پیش کیا اُس پر اُردو انشا پردازی آج تک ناز کرتی ہے اور کرتی رہیگی۔ مہدی حسن مرحوم افادی الاقتصادی جو میر صاحب سے عقیدتِ خاص رکھتے تھے چُپ نہ رہ سکے اور "تیرہویں صدی" کے متعلق یوں اظہارِ خیال کیا۔

"میں آپ کے لٹریچر کا اُس وقت سے دلدادہ ہوں جب لٹریچر کا صحیح مفہوم بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ کم و بیش بیس برس ہوئے جب آپ نے ایک وضع خاص پر لکھنے پڑھنے کا مشغلہ جاری کیا یعنی "تیرہویں صدی" میں دادِ سخن دی "تہذیب الاخلاق" کے ساتھ ساتھ آپ نے جس ٹھاٹھ سے دھواں دھار مضامین لکھے اور سرسیّد کے لٹریچر پر جس سلیقے اور سخن گسترانہ شوخیوں سے آپ نے انتقادات کی ٹھہرائی سچ یہ ہے وہ اُردو لٹریچر کی جان ہیں۔ آج سنجیدگی اسقدر بڑھ گئی ہے کہ میں نہیں جانتا ملک کے نامور اہلِ قلم آپ کے گذشتہ کمالات کی داد دیں گے۔ لیکن میں کھُل کر کہنا چاہتا ہوں کہ آپنے اُس وقت انشا پردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لئے تھے۔ آپکا ادبی مذاق اور خاص طرح کا مادہ اختراعی (اور تخیلی) دراصل آپکے اوّلیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔"

[1] میر صاحب مرحوم کے لٹریچر پر ایک بسیط تقریظی مقالہ بھائی شاہد احمد صاحب نے سپردِ قلم فرمایا ہے جو اسی نمبر میں شامل ہے اس لئے اس موضوع پر میرے لئے خامہ فرسائی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

۱۸۸۱ء میں یہ رسالہ بند ہو گیا۔

زمانہ:- "تیرہویں صدی" کے بعد ہی دوسرا رسالہ "زمانہ" آگرہ سے جاری ہوا۔ افسوس اس وقت اس کا ایک بھی نمبر نہ مل سکا جس سے اسکی خصوصیات کا اندازہ لگایا جا سکتا۔ میں تلاش میں ہوں اگر دستیاب ہوا تو بہت جلد اس کے متعلق بھی کچھ عرض کروں گا۔ یہ رسالہ چار یا پانچ سال بعد بند ہو گیا۔

افسانۂ ایام:- "تیرہویں صدی" اور "زمانہ" کے بعد نصرت المطابع دہلی سے "افسانۂ ایام" جاری ہونا شروع ہوا۔ اسکے متعلق خود میر صاحب مرحوم کی زبان سے یہ سن لیجئے:-

"افسانۂ ایام" نامی ایسا پرچہ نکالا جاتا ہے جو اعلیٰ لٹریچر یعنی غایت فصاحت اور کمال انشا کا نمونہ ہو۔ جس میں وسعت خیال اور ہر طرح کے اظہار کمال کا وہ اہتمام کیا گیا ہے کہ مضامین علمی و تحقیق فلاسفی اور الٰہیات و دینیات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہو سکے۔ یعنی جو غرض "تیرہویں صدی" اور "زمانہ" نامی پرچوں سے تھی وہ نہ جانے پائے اور ساتھ ہی عمدگی مضامین میں ولایت کے اعلیٰ لٹریچر کے عمدہ پرچوں سے کم نہ ہو۔ جن باتوں میں زمانے نے ترقی کی ہے اس کی حقیقت بتائی جائے کہ اقبال مند قوموں کے نمونے نے کیا اثر پیدا کرنے۔ ہماری بگڑی طبیعتیں کس طرح سنبھل سکتی ہیں۔ زمانے کے ساتھ ترقی کرنے میں ہمیں کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہے ؎

اورا بہمی گر نہ تواں ساختن ز خویش — فرض ست در تلاش کہ خود را ازو کنن

یہ پرچہ صرف اُن لوگوں کے کام کا ہے جن کی علمی لیاقتیں بڑھی ہوئی ہیں۔ اس سے غرض یہ ہے کہ جن باتوں اور مسئلوں کا زمانہ میں شور ہے اُنکے سمجھنے اور اُن پر رائے دینے کا موقع اہل علم کو ملے اور اسلام کی طرف سے زمانہ میں ایسا یادگار رہے جس کی اہل کمال کی نظر میں ہمیشہ قدر ہو تا کہ کہنے کو تو ہو جائے کہ ؎

کیا پھوٹ کے روئے ہیں مرے پاؤں کے چھالے — پوچھی تھی ذرا چھیڑ کے تکلیف سفر آج"

افسانۂ ایام میں سر تا سر تمام مضامین میر صاحب مرحوم ہی کے ہوتے تھے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس قدر اہم ہیں کہ تاریخ ادب میں یادگار رہیں گے۔ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ رسالہ کب بند ہوا۔ شاید دو تین برس تک ضرور جاری رہا۔

ناصری:- ۱۸۸۸ء میں "ناصری" نامی رسالہ نصرت المطابع دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے مقالۂ افتتاحیہ میں میر صاحب مرحوم فرماتے ہیں:-

"مدت سے یہ شکایت ہے کہ اعلیٰ لٹریچر کا کوئی پرچہ ایسا نہیں نکلتا جس میں ہمارے ملک اور زبان کی ترقی کے پورے سامان ہوں۔ یہ شکایت مٹانے کے لئے "ناصری" نامی ایک پرچہ نصرت المطابع دہلی سے نکالا جاتا ہے۔ پرانے اخبار و ملکی بیقدری میں نیا پرچہ نکالنا گویا بیقراری میں برق رخسار کا تماشہ ہے لیکن جس طرح بیدک کے علاجوں میں گرمی کا علاج گرمی سمجھا جاتا ہے اُسی طرح نئے پرچوں کا نکلنا اخبار

کی ترقی کے عجیب سامانوں میں ہے۔ یہ نہیں تو بڑی وجہ اس پرچہ کے نکالنے کی یوں سمجھئے کہ عموماً ہندوستان کے اخباروں کی ردّی حالت ہی اسبات کی متحرک ہوئی کہ ایک اچھا پرچہ نکالا جائے جو اس فن کی آبرو کا سبب ہوا۔ ؎

این نامہ کہ بود قطع این فرش — من می برنش بہ کنگرۂ عرش
این لعل کہ داشت پائے در گل — من می نہمش بہ کرسیٔ دل
این جرعہ کہ ریختند بر خاک
من می کشمش بجام افلاک

"ناصری" کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مزاح کا عنصر بیش تر تھا۔ مرزا حیرت دہلوی اس کے خاص مضمون نگاروں میں سے تھے۔ خدا معلوم یہ کب تک جاری رہا۔

"صلائے عام": "ناصری" کے بعد میر صاحب مرحوم نے "مطبع ناصری" کے نام سے اپنا ایک مختصر سا پریس کھولا جس میں صرف "صلائے عام" چھپتا تھا۔ مارچ ۱۹۰۸ء سے "صلائے عام" کی ابتدا ہوئی اور اکتوبر ۱۹۳۲ء تک برابر جاری رہا۔ اسی سے اس کے مرتبے کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ آج تک اُردو کے کسی رسالے کو اتنی طویل عمر نہ نصیب ہوئی۔ ۲۴ برس تک "صلائے عام" نے اُردو ادب کی جو خدمت کی وہ سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ تاریخ ادب میں اُس کی مثال ملنی ناممکن ہے۔ ۲۴ برس کے گرانقدر سرمایہ پر (جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے) تقریباً کچھ لکھنا میرے بس کی بات نہیں اور نہ یہاں اس کی گنجائش ہے۔ بشرطِ زندگی وقتاً فوقتاً اُس کے متعلق کچھ عرض کرتا رہونگا۔ صرف اتنا سن لیجئے کہ صلائے عام میں متفرق عنوانوں کے تحت وہ تمام ضروری امور وقتاً فوقتاً زیر بحث رہے جن کا تعلق ہماری اخلاقی اور دماغی تہذیب و تربیت سے ہے۔ فطرتِ انسانی کے وہ دقیق راز جو عام نگاہوں سے پوشیدہ تھے اور وہ تمام اہم مسائل جن کو موجودہ سوسائٹی کو بوجوہ سخت ضرورت تھی ایک ایک کر کے طے کر دئے گئے۔ جن میں من حیثیت الموضوع اتنی جامعیت ہی کہ ہر مضمون بجائے خود ایک قولِ فیصل ہے۔ مضامین غیر کے علاوہ خود میر صاحب کے مضامین اپنی بقا کے آپ ضامن ہیں۔ لٹریچر کے وہ اجزا جن کا موضوع زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے (مثلاً فلسفۂ حیات تاریخ وغیرہ) جن میں وسعتِ خیال کے ساتھ تحقیق و تنقید۔ تفریعِ مسائل اور غیر منقطع انضباطِ خیال کی ضرورت ہی فاضل ادیب نے اپنے خالصتاً مشرقی اسلوب تحریر میں اس طرح یکجا کر دئے ہیں کہ جس کی تقلید بھی ناممکن ہی۔ "مضمونِ پریشاں" اور "محشرِ خیال" اپنے خصائص نوعی کے اعتبار سے اتنے اہم ہیں کہ آج قوم کا خدائے نثر لٹریری دُنیا میں جہاں تک کہ پاکیزہ اور سلجھے ہوئے خیالات کے ساتھ بے مثل فصاحت اور دقیع انشاپردازی کا تعلق ہے اپنے معاصرین سے علانیہ ممتاز ہے۔ "صلائے عام" کے متعدد ارتقائی دور ہیں اور ہر دور کی امتیازی خصوصیات بیان کرنے کے لئے بسیط مقالوں کی ضرورت ہے جس کا یہاں محل نہیں۔

"صلائے عام" سے متعلق تمام کام میر صاحب خود ہی کرتے تھے۔ خود ہی کاپیاں اور پروف پڑھتے تھے اور خود ہی ڈاک کے جوابات لکھتے تھے۔ یہ ظاہر کردینا بھی ضروری ہے کہ "صلائے عام" سے کبھی اتنی آمدنی بھی نہ ہوئی کہ اُس کا خرچ نکل سکتا۔ تنخواہ ۱۵۰ روپے ماہوار کا مستقل خرچ تھا جسے مرحوم انتہائی وضعداری اور عالی حوصلگی سے آخر دم تک نبھاتے رہے۔ نہ کبھی صلائے عام" میں اشتہارات شامل کئے گئے۔ ناممکن ہے کہ اس معیار کا خالص ادبی رسالہ دوبارہ شائع ہوسکے۔ اُردو صحافت صلائے عام پر ناز کرتی رہیگی۔

مقاماتِ ناصری:۔ بیس برس پہلے سے میر صاحب مرحوم کے احباب کا تقاضہ تھا کہ اُن کے قلم کے موتیوں کو جو "صلائے عام" اور "تیرہویں صدی" میں بکھرے پڑے ہیں کتابی صورت میں شائع کردیا جائے جس سے ایک مستقل یادگار قائم رہ سکے۔ مہدی مرحوم جو میر صاحب مرحوم کے دل سے معتقد تھے لکھتے ہیں:۔

"...... "تیرہویں صدی" میں آپ کا عنصر غیر فانی ہے۔ لیکن افسوس ہے آپکو یہ خیال نہ آیا کہ جس سے پچھلے دنوں اتنے دماغی سلیقے رہے وہ ہیئت مجموعی کتابی صورت میں جلوہ گری کا حق رکھتی۔ اِس پاکیزہ مجموعے کی ترتیب سے اُردو ادب عالیہ (کلاسیکس) میں آپ کی طرف سے مستقلاً قیمتی اضافہ ہوتا جو یادگارِ زمانہ رہتا۔ آپ معاف فرمائیں گے یہ بدترین حق تلفی تھی جو آپ اپنی کرسکتے تھے......"

لیکن ہمارے لائقِ تعظیم مشرقی مشاہیر کی ایک آن یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ شہرت تو رہی ایک طرف واجبی حقائق کی نمائش کو بھی پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ میر صاحب مرحوم بھی ٹالتے رہے۔ "ساقی" کے اجراء کے بعد سے ہم لوگوں کو غیر معمولی طور سے مُصر ہونیکا موقعہ ملا جس سے مرحوم کچھ کچھ آمادہ ہوچلے تھے۔ لیکن زیست نے مہلت نہ دی۔ اتنا ضرور رہا کہ ایک پُرکیف نام تجویز کرگئے۔ یادش بخیر! ایک مرتبہ میں اور بھائی شاہد احمد صاحب اُن کی خدمت میں حاضر تھے۔ برسبیلِ تذکرہ "مجموعۂ مضامین" کا مسئلہ بھی چھڑ گیا۔ میں نے "افاداتِ ناصری" نام تجویز کیا۔ مرحوم چیں بجبیں ہوکر بولے "میں مہدی سے گھٹ کر نہیں رہنا چاہتا۔ میں نے مقاماتِ حریری اور مقامات حمیدی کے وزن پر مقاماتِ ناصری سوچا ہے"۔ مرحوم کا ارادہ تھا کہ بہت جلد انتخاب شروع کردیں گے جس سے متعلق کچھ خدمات مجھے بھی تفویض ہوئی تھیں۔ لیکن افسوس! زندگی نے وفا نہ کی اور یہ تمام ارادے صرف حسرتیں بن کر رہ گئیں۔ خدا معلوم مرحوم مقاماتِ ناصری کے لئے کیا کیا اہتمام نہ کرتے۔

میں نے اپنی کم علمی اور ہیچمدانی کے باوجود اس متبرک فرض کو اپنے ذمے لے لیا ہے۔ خدائے عزّ و جل مجھے اس کی توفیق عطا کرے کہ اس اہم فرض کو بحسن وخوبی انجام دے سکوں!!!

آخری علالت:۔ وسطِ فروری ۱۹۳۳ء میں مرحوم کو پیشاب نہ آنیکی شکایت ہوئی۔ کئی دن تک صاحبِ فراش رہے

پہلے ڈاکٹر ناصر عباس صاحب کا اور پھر ڈاکٹر جے۔ کے سین کا علاج ہوا۔ جس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ سلائی کے ذریعے پیشاب نکالنے اور مثانہ کو بورک لوشن سے دھونے سے آرام ہو جاتا تھا۔ پیشاب نکالنے اور مثانہ دھونے کی خدمت میں اور میرے چچا صاحب انجام دیتے رہے۔ ذیابیطس کا مرض مرحوم کو بہت پرانا تھا۔ دن میں کئی مرتبہ پیشاب آتا تھا۔ اس سے اور بھی تکلیف ہوتی تھی۔ آخر مارچ تک طبیعت بہت کچھ سنبھل گئی تھی۔ پیشاب خود بخود آنے لگا تھا کہ دوسرا حملہ پھر ہوا۔ اِس مرتبہ قبض کی شکایت بھی ہو گئی۔ ڈاکٹر شریف حسین صاحب کا علاج ہوا۔ کئی دن تک ڈاکٹر صاحب روزانہ آتے رہے۔ بہت جلد حالت روبہ صحت ہو گئی۔ اور کچھ عرصے بعد نمایاں افاقہ ہوا۔ لیکن سلائی روزانہ لگائی جاتی تھی۔ میرے والد ماجد اس عرصہ میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک دن مرحوم کو جامع مسجد لے کر گئے۔ مرحوم بہت خوش ہوئے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ چوک کی یہ سیر آخری تھی۔ آخری حملہ وسطِ مئی میں ہوا۔ اس مرتبہ نقاہت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ بمشکل پہچانے جاتے تھے۔ ڈاکٹر کاظم حسین صاحب کا علاج ہوا۔ یہ ڈاکٹر صاحب بہت اہتمام کرتے تھے اور پورے ایک گھنٹے میں پیشاب نکالنے اور مثانہ دھونے کا عمل پورا ہوتا تھا۔ بتدریج حالت بہتر ہونی شروع ہوئی مگر کمزوری روز بروز زیادہ ہی ہوتی رہی۔ علاوہ ازیں مرحوم کے ذہن میں یہ بات نقش ہو چکی تھی کہ "اب میں نہیں بچنے کا۔" حالانکہ اس سے پہلے سخت سے سخت بیماری اُٹھانے پر بھی مرحوم یہی کہتے تھے کہ "ہم مرینگے نہیں۔" اب اسکو الہام کہیئے یا وہم لیکن وہ وثوق کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ یہ بیماری میری آخری بیماری ہے۔ انتہائی کمزوری کی وجہ سے مرض از سرِ نو عود کر آیا۔ اس مرتبہ پیشاب کے ساتھ پیپ بھی آنے لگی۔ ۵ رجون کو میں فرخ نگر سے مرحوم کی خیریت دریافت کرنے حاضر ہوا۔ حالت تشویشناک تھی۔ میں اُسیدن فرخ نگر واپس چلا گیا۔ ۸ رجون کو ہم سب فرخ نگر سے اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مرحوم بہت خوش ہوئے اور سب کو جمع کر کے ہمارے آنیکی خوشی میں چاء پلائی۔ آہ! یہ آخری چاء تھی جو ہم نے مرحوم کے ساتھ پی! کس شفقت اور محبت سے مرحوم نے ہم سے باتیں کیں!! دوسرے دن سے مرحوم کی حالت خراب ہونی شروع ہوئی۔ والد ماجد نے ڈاکٹر منیرا صاحب کا علاج شروع کیا۔ تیسرے دن حالت بالکل بگڑ گئی۔ چوبیس گھنٹے خاموش پڑے رہے۔ آنکھیں دھنس چکی تھیں، کھانا پینا قطعی بند ہو چکا تھا۔ بارلی واٹر کے قطرے چمچے کے ذریعے ٹپکائے جاتے تھے۔ نقاہت اتنی تھی کہ بس ہڈیوں کی مالا معلوم ہوتے تھے۔ بے سہارے بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ صبح کو ڈاکٹر صاحب نے انجکشن لگایا۔ اُسی دن ڈاکٹر کے مشورے سے انیما دیا گیا۔ پیشاب بھی نکالا گیا۔ مگر کسی طرح مرحوم آنکھ ہی نہیں کھولتے تھے۔ میرے والد نے کہا "میری خاطر سے آپ آنکھیں کھول کر ذرا مجھے دیکھئے تو۔" مرحوم نے بڑی کوشش سے آنکھیں کھولیں۔ اور شفقت بھری نگاہ سے آخری مرتبہ میرے والد کو دیکھا میرے والد نے پوچھا "آپ مجھ سے خوش ہیں" مرحوم نے اتنا کہا "ہاں بیٹا! خدا تجھے خوش رکھے"۔ اور زار و قطار رونے لگے۔ چوتھے دن حالت دگرگوں ہو گئی۔ بارلی واٹر زبردستی حلق میں ٹپکایا جاتا۔ ایسے لوتھ ہوئے پڑے رہتے کہ کسی سے بات تو کجا آنکھ بھی نہ کھول سکتے تھے۔ ۱۲ بجے سب کو معلوم ہو گیا کہ آخری وقت آ پہونچا۔ ہم سب۔ بوڑھے۔ جوان۔ بچے

جمع تھے (خوش قسمتی سے مرحوم کی ساری اولاد۔ پوتے، پوتیاں۔ نواسے، نواسیاں حتٰی کہ پرنواسیاں بھی حادثہ کے وقت موجود تھیں) دو بجے کے قریب سانس اُلٹا۔ یٰسین شریف سُنائی گئی۔ تین ہچکیاں آئیں اور گلشنِ ادب کا یہ چہکتا طوطی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا! اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون!!! کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ یہ بزرگ اب ہم میں نہیں رہے۔ ہم سب بے آسرے ہو گئے۔ میرے والد ماجد کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ بالکل خدانخواستہ دیوانے معلوم ہوتے تھے۔ ایسے شفیق باپ کے گذر جانے کا جتنا صدمہ ہوتا کم تھا۔ سنگدل سے سنگدل انسان کا بھی دیکھنے سے کلیجہ پھٹ جاتا۔ آہ! اُن کا اپنے نیک باپ کے آخری مرتبہ پاؤں چومنے کا منظر جب آنکھوں میں پھر جاتا ہے تو بے اختیار آنسو آجاتے ہیں۔ کس کے قلم میں طاقت ہے کہ اس زہرہ گداز نقشہ کو الفاظ میں ادا کر سکے۔ ایک کہرام تھا۔ ایک ماتم تھا۔ غم کے تیز نشتر سب کے دلوں کی گہرائیوں میں اُترے ہوئے تھے۔ آہ!

تجہیز و تکفین:- حادثہ سے بیس برس پیشتر میرے والد ماجد کو مرحوم نے ایک خط میں لکھا تھا کہ:-

"...... تم میری وصیت یاد رکھنا کہ والد کی پائینتیں مجھے گاڑ دینا اور اُن کے کٹہرے سے ملا دینا اُس کے بعد مجھے کوئی تمنا نہیں اور لوح پر یہ شعر کندہ کرا دینا" سہ

جایم بروز واقعہ پہلوئے او کنید | او قبلۂ من است رُخم سوئے او کنید"

اِسی پر عمل کیا گیا اور مولوی ابوالمنصور مرحوم کے پہلو میں میر صاحب مرحوم کے جسدِ بے جان کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ آہ! کل تک جس کا سایۂ عاطفت ہمارے سروں پر تھا آج وہ ہزاروں من خاک کے نیچے دفن ہے۔ آہ! خاندان کی رونق۔ خاندان کی عزت، خاندان کا اقبال سب اُسی کے ساتھ رخصت ہو گئے!!! سہ

صورتے از بے صورتی آمد بروں | باز شد اِنّا الیہ راجعون

ماحصل: انسان میں جہاں بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں وہاں چند عیب بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ایک انسان کی بہت سی اچھی باتیں تھوڑی سی بُرائیوں پر چھا جاتی ہیں۔ مرحوم میں دل و دماغ کی عجیب عجیب خوبیاں اس افراط سے جمع تھیں کہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں ایسی نیک، با وضع اور مُتبرک ہستیاں قطعی ناپید ہیں۔

اے پاک ربِّ عظیم! ہمیں اِس بات کی توفیق عطا کر کہ ہم مرحوم کے نقشِ قدم پر چلنا اپنے لئے ایک سعادت خیال کریں۔ اور اُس کے نام کو بھلائی کے ساتھ روشن رکھ سکیں۔ تاکہ ہماری آنکھیں اُس کی غیر فانی روح سے اور تجھ سے کبھی نیچی نہ ہوں۔ ہدایت دے اے ربِّ کریم اِس بات کی کہ ہم اُنکی نیکیوں کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں!!!

دلفگار **انصار ناصری**

میر صاحبؒ کا نظریۂ حیات

از جناب فضل حق قریشی دہلوی

میر صاحب "صلائے عام" کے مدیر ہی نہیں تھے بلکہ بذاتِ خود ایک باکمال نقاد اور زبردست انشا پرداز بھی تھے۔ ان کا اسلوبِ بیان اور ندرتِ خیال، محاورات کی بندش اور رعایتِ الفاظ، تمثیلات کا محاکمہ اور جذبات کی کیفیات لوحِ ادب پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش کی طرح ہمیشہ مُرتسم رہینگی۔ قسامِ ازل نے ان کی طبیعت میں بذلہ سنجی۔ فطرت میں خوش مذاقی اور طینت میں شوخی کچھ اس درجہ ودیعت کی تھی کہ اس پُر آشوب زمانہ میں بھی نوّے سال کی زندگی گذار دینے کے باوجود آخیر عمر تک کسی قسم کی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ فلسفہ کے دقیق ترین مسائل کو سلاستِ زبان کے ساتھ بیان کرنے میں اتنی حیرت انگیز دسترس حاصل تھی کہ مرواریدِ تخیّل کو جس انداز سے چاہتے سلکِ ادب میں منسلک کر دیتے۔ اسی وجہ سے فصحائے زماں سے لیکر مدرسہ کے معمولی طلبا تک ان کے مضامین کا مطالعہ نہایت دلچسپی سے کرتے تھے۔ بذاتِ خود شاعر نہیں تھے مگر شعر پر صحیح اصلاح دینے میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ دقیقہ سنجی اور سخن فہمی کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے باکمال شعرا ان کی زبان سے اپنے کلام کی داد لینا باعثِ فخر تصوّر کرتے تھے۔ اس امر کا ادنیٰ ثبوت یہی ہوسکتا ہے کہ دہلی کی بزمِ مشاعرہ میں کئی بار کرسیِ صدارت پر متمکن ہوئے۔

مجھے میر صاحب کے ساتھ صرف ایک مرتبہ ہم نشینی کا موقعہ نصیب ہوا۔ اور وہ بھی باندازۂ یک شبِ وصل نہایت قلیل عرصہ کے لئے۔ مگر ان مختصر لمحات میں اُن کی گفتگو سے جو فیض میں نے حاصل کیا۔ اُس کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ اور اس کے لئے ہمیشہ ان کا مرہونِ منت رہونگا۔ سب سے زیادہ خوشی اُس وقت ہوئی جب اُنھوں نے میرے بعض مضامین اور افسانوں کی داد دے کر میری ہمت افزائی کی۔ تحسینِ سخن شناس صاحبِ قلم کے لئے یقیناً باعثِ فخر ہے۔

بہر حال یہ ایک جملۂ معترضہ تھا۔

جب میں نے سُنا کہ ساقی کا "ناصر نمبر" شائع ہوگا تو تہیّہ کر لیا کہ میں بھی مرحوم کی یاد میں اپنے خیالات سپردِ قلم کرونگا۔ کیونکہ اُن کی روح کو آخری خراج صرف اسی طرح ادا کیا جا سکتا ہے۔ میری نظر کے سامنے بے شمار موضوع تھے۔ مگر "نظریۂ حیات" کا عنوان اِس لئے قائم کیا کہ اس ضمن میں میر صاحب نے بہت کچھ خیال آرائی کی ہے کاش! مجھے "صلائے عام" کے تمام پرچے مِل جاتے تو ایک بسیط مضمون لکھتا۔ تاہم جو پرچے دستیاب ہوسکے اُنہی کو مدِنظر رکھکر ایک مختصر مضمون سپردِ قلم کر دیا۔

سب سے پہلے میر صاحب کے نقطۂ نظر سے مقصدِ حیات کو معلوم کرنا چاہیئے۔ فرماتے ہیں:۔

"مآلِ زندگی دریافت کرنے کی ضرورت اس وجہ سے زیادہ ہے کہ انسان کو جس کام کا مآل نظر نہیں آتا۔ اس میں دل لگانے کو جی نہیں چاہتا۔"

یہ حقیقت ہے کہ جب تک ہم کو کسی چیز کا مقصد معلوم نہ ہو جائے اُس میں دلچسپی نہیں لیتے۔ ابتدائی جماعتوں کے طلبا کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ تعلیم کا مقصد کیا ہے۔ اس لئے وہ دل لگا کر نہیں پڑھتے۔ اور نہ باقاعدگی سے کام کرتے ہیں۔ مگر مقصدِ تعلیم سے واقف ہو جانے کے بعد صدہا رُکاوٹوں کے باوجود اس کے حصول کے لئے سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح باقتضائے عمر نوجوانوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شباب کا مقصد عورت کے لئے تکمیلِ حُسن اور مرد کے لئے تخلیقِ عشق ہے۔ اور جب وہ اپنی ناواقفیت کے باعث عہدِ شباب کی مسحور کُن رنگینیوں کو غلط طریقہ پر صرف کر دیتے ہیں تو سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔

زندگی کے متعلق بہت سے نظریے قائم کئے گئے بقول میر صاحب:۔

"دُنیا کی ضرورتوں کے موافق انسان نے اپنی زندگی کا مآل سمجھ لیا۔"

ایک گروہ نے کہا کہ عبادتِ الٰہی انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ اُسکو چاہیئے کہ ہر وقت رکوع و سجود میں رہے اور صوم و صلوٰۃ کی پابندی کرے۔ مگر دوسرے گروہ نے پُرزور الفاظ میں اس کی تردید کی اور کتنا اچھا استدلال پیش کیا ہے ؎

دردِ دل کیواسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

چند منچلے نوجوانوں کا قول ہے کہ کھاؤ پیو اور مزے کرو۔ یہی زندگی کا مقصد ہے۔ مگر اس کی بھی تردید کی گئی کہ یہ مقصد تو جانوروں کی زندگی کا بھی ہو سکتا ہے۔ انسان کو۔ جو اشرف المخلوقات میں سے ہے۔ اپنی ہستی کو ان سطحی چیزوں سے بالاتر رکھنا چاہیئے۔ ہمیں معلوم کرنا چاہیئے کہ میر صاحب اس ضمن میں کیا کہتے ہیں۔ آپ کا قول ہے کہ:۔

"دُنیا میں سب سے اچھی زندگی میں اُسے سمجھتا ہوں کہ ہم کسی کو چاہیں اور کوئی ہمیں چاہے۔"

ہر چند یہ نظریہ کچھ نیا نہیں مگر اندازِ بیان میر صاحب کا حصّہ ہے۔ اِس ضمن میں مجھے اپنے محترم اُستاد کا ایک شعر یاد آگیا ؎

قالبِ انسان ازل میں عشق کی خاطر بنا اس نشیلی مے کے لائق بس یہی پیمانہ تھا

میر صاحب کے طرزِ بیان میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ موقعہ کی مناسبت کے لحاظ سے نہایت موزوں اشعار نقل کرتے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں مثنوی کے یہ دو شعر درج کئے ہیں ؎

بہ روئے پرستیدنِ آں صنم بہ ملکِ وجود آمدم از عدم

وگرنہ مرا میلِ ہستی نہ بود سرِ د برگ و یزداں پرستی نہ بود

مگر میر صاحب کا قول دُنیائے شعر سے قطع نظر حقائق پر مبنی ہے محبت کو زندگی کا مقصد ضرور بتایا مگر شاعرانہ موشگافیوں سے احتراز کرتے ہوئے چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"محبت میں اگر مرنے کو جی چاہے تو مرگ سے بدتر ٹھیری"

شاعر کے لئے نہایت آسان ہے کہ معشوق کی ہر ادا پر عاشق کے رشتۂ حیات کو قطع کرادے۔ اس کی ہر بے وفائی پر اسے خودکشی کے لئے آمادہ ہونے دے مگر میر صاحب نے مرنے کی آرزو کو مرگ سے اس لئے بدتر بتایا ہے کہ موت انسان کی پریشانیوں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اور فضائے محبت میں سانس لینے کے بعد دُنیا کے رنج والم گراں معلوم نہیں ہوتے۔ بقول میر صاحب:۔

"محبت میں کوئی مصیبت کوئی تکلیف اکھرتی نہیں"

اس لئے اگر بفرضِ محال کوئی پریشانی نصیب بھی ہو تو اس سے گھبرا کر مرنے کی آرزو کرنا مسلکِ عشق میں ناروا ہے۔ اس رمز کو تو اہلِ درد ہی خوب سمجھ سکتے ہیں کہ دل کے دُکھ جانے میں کس قدر لذت پنہاں ہوتی ہے۔ زندگی اور خاص طور پر محبت کی زندگی اگر یکرنگی کے ساتھ سکون و طمانیت کے گہوارے میں بسر ہو تو اپنے اندر دلبستگی کا کوئی سامان نہیں رکھتی۔ میر صاحب فرماتے ہیں۔

"جس محبت میں ناچاقیاں نہیں، وہ محبت نہیں زمانہ سازی ہے۔ چاہنے والوں کی شکایتیں تجدیدِ محبت کے اسباب ہیں"

باوجود کوشش کے میں یہ معلوم نہ کر سکا کہ میر صاحب نے محبت کا کیا معیار قائم کیا ہے۔ اور یہ کہ وہ محبت کی شادی کے قائل ہیں یا نہیں۔ تاہم ذوقِ تجسس نے اُن کا ایک قول ایسا ڈھونڈھ نکالا ہے جس سے یہ استنباط کرنا آسان ہے کہ وہ ازدواجِ عشق کے خلاف تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"عشق کو دل سے واسطہ ہے اور ہوس کو نفس سے جس کو ہوس سے کام لینا ہو۔ وہ دل سے واسطہ نہ رکھے"

یہ امر مسلّم ہے کہ شادی کے جہاں اور مقاصد ہیں وہاں سب سے بڑا مقصد یہ بھی ہے۔ کہ شہوانی جذبات کی تسکین کی جائے۔ اور یہی مظہرِ نفس وہ سمِ قاتل ہے۔ جس کی ہلاکت آفرینیاں شعریت و شباب کی تمام رنگینیوں کو بے آب و رنگ کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ ازدواجِ محبت کی حمایت کرنے والے ایک "جائز گناہ" کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ دُرست ہے کہ محبت ہو جانے کے بعد بعض اوقات وصلِ محبوب کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ مگر انسان کی یہ آرزو اشتہائے کاذب کی طرح بالکل غیر حقیقی ہوتی ہے۔ وقتی طور پر یہ آرزو پیدا ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں مگر عملی طور پر کوئی عاشقِ صادق اس کو گوارہ نہیں کرے گا۔ اور آرزو وہی اچھی ہے جس کا وجود بھی ہو اور امکان بھی مگر پوری نہ ہو بلکہ ارادتاً اسکو پورا نہ کیا جائے۔ میر صاحب لکھتے ہیں:۔

"انسان کی ہر تمنا برآئے تو اس کی زندگی اکارت سمجھئے۔ اس کی خوشی پوری نہ ہونے ہی میں اس کی زندگی کا لطف ہے۔ کہ کسی نہ کسی آرزو کی تلاش میں بسر ہو۔"

موضوع محبت کو چھوڑنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کے زاویۂ نگاہ سے صنفِ نازک کی ہستی کا مطالعہ بھی کیا جائے کیونکہ ایوانِ محبت کی تعمیر میں اسی صنف کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس ضمن میں مجھے زیادہ تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں، اس کے لئے ایک علیحدہ عنوان درکار ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں :۔

"عورت میں استغنا اتنا ہے کہ بچوں کے پالنے کی مصیبت آپ اُٹھائے اور عدالت میں مرد کے حوالے کر دے۔"

ایک بچّے کی تخلیق میں مرد سے زیادہ عورت حصہ دار ہے۔ کیونکہ وہ اپنے شکم میں رکھ کر اس کی پرورش کرتی ہے۔ لیکن اگر اتفاق سے زن و شوہر میں علیحدگی ہو جائے تو عدالت کا اندھا انصاف یہ حکم نافذ کرتا ہے کہ اولاد اپنے باپ کی ملکیت ہے۔ گویا عورت کو اُن بچوں سے ذرا بھی تعلق نہیں جن کو صرف جنتے وقت اس نے اس قدر تکلیف ضبط و تحمل کے ساتھ برداشت کی تھی کہ اگر اس کا ایک دسواں حصہ بھی مرد کے سر پر ڈال دیا جائے تو بلا مبالغہ وہ زندگی سے بیزار ہو جائیگا۔

عورت کو عموماً ناقص العقل کہا جاتا ہے۔ لیکن میر صاحب نے کتنے اچھے طریقے سے اسکی تکذیب کی ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"عورت سے اپنی سَوت چھپی نہیں رہتی۔ اور مرد کو عورت کا آشنا دیر میں معلوم ہوتا ہے، اس میں ذہن کی تیزی کس کی نکلی۔"

عورت اگر اپنے رازوں کو پوشیدہ رکھنا چاہے تو مرد پر ظاہر نہیں ہو سکتے۔ لیکن مرد باوجود کوشش کے اپنے حالات عورت سے مخفی نہیں رکھ سکتا۔ ایک اسی امر سے ثابت ہو سکتا ہے کہ عورت مقابلتاً ذہین الطبع ہے۔ علاوہ ازیں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ عورت اگر چاہے تو وہ کام بھی کر سکتی ہے جو صرف مرد ہی کے لئے موزوں ہے۔ میدانِ جنگ میں وہ سینہ سپر نظر آتی ہے صنعت و حرفت میں اس کو دسترس حاصل ہے۔ اور کوئی علم و فن ایسا نہیں۔ جس میں وہ مرد سے پیچھے ہو۔ لیکن اگر مرد چاہے تو روتے بچّے کو بھی اس قدر آسانی اور خوش اسلوبی کے ساتھ خاموش نہیں کر سکتا۔ جس طرح ایک عورت۔ میر صاحب لکھتے ہیں :۔

"عورت اگر مرد کے کاموں میں دخل دے تو گمان ہے کہ مرد کے برابر کر دکھائے۔ مگر مرد سے عورت کے کام ہونے مشکل ہیں۔"

میر صاحب کے مذہبی عقائد بھی بہت پختہ تھے۔ اُنہوں نے اس امر پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ کہ عقائد کو عقل کی روشنی میں کبھی نہ دیکھا جائے۔ اِسی لئے وہ دہریوں کے بہت مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دہریئے کبھی اطمینانِ قلب کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ بہتری اسی میں ہے کہ ہر عقیدہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر تسلیم کر لیا جائے۔ لکھتے ہیں :-

"عقیدوں کے دم کی خیر منانی میرے ایمان کی جڑ ہے"

بے شک اَن دیکھے خدا کے وجود کو تسلیم کر لینے سے تعمیرِ کردار میں بہت زیادہ مدد ملتی ہے۔ ایک یونانی فلسفی کا قول ہے کہ اگر بفرضِ محال خدا کا وجود نہیں ہے تو ہم کو چاہیئے کہ اپنے خیالات کی دُنیا میں اُسے تخلیق کر لیں۔ اسی ضمن میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

جس عقیدے میں عقل سے کام لیا جائے وہ اسی قدر مضبوط نہیں رہتے۔ جس قدر کہ بے دلیل و حجت کا مانا ہوا عقیدہ"

تعویذ گنڈوں کی حقیقت خواہ کچھ بھی ہو۔ مگر جو لوگ اس کے قائل ہیں، خاطر خواہ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ اُنہیں کامیاب بنا دیتا ہے۔

میر صاحب بذاتِ خود اگر صوم و صلوٰۃ کے پابند نہیں تھے تو نہ سہی۔ اُن کا کردار نہایت ارفع و اعلیٰ تھا۔ "دل بدست آور کہ حج اکبر است" کے قائل تھے۔ خدمت النّاس کو تمام زہد و اتقاء اور نماز روزہ سے زیادہ افضل تصور کرتے تھے۔ فرماتے ہیں :-

"مخلوق کا دُکھ درد مٹانے سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی نیکی نہیں۔ خلقِ خدا کی درد و تکلیف مٹانے کی تدبیر گویا دُنیا کو آباد کرنا ہے"

اُنہوں نے مولویوں کے اس قول پر اعتراض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دُنیا کو آباد کرنے سے قبل جنت و دوزخ کو بنا دیا تھا۔ کیونکہ قبل از وقت دوزخ بنانے کا یہ مطلب نکل سکتا ہے کہ خدا ارادتاً انسان کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کرنی چاہتا تھا کہ وہ گناہ کرے اور انجام کار دوزخ آباد ہو۔ جبکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہر شخص کی تقدیر روزِ ازل ہی رقم کر دی گئی تھی۔ فرماتے ہیں :-

"ابتدائے عالم سے گنہگاروں کے لئے دوزخ کا پیدا کر دینا کہ ہنوز ہم نے گناہ نہیں کیا"

یومِ آخرت پر تقریباً تمام مذاہب کا عقیدہ ہے۔ کہ مرنے کے بعد ایک دن ایسا ضرور آئیگا۔ جب ہمارے اعمال کی پڑتال ہوگی اور نیکی و بدی کے مطابق ہم کو جزا اور سزا ملے گی۔ میر صاحب لکھتے ہیں :-

"قیامت میں مجھے میری تقصیروں کی سزا ہوئی۔ دوبارہ نیکی کرنے کا موقع کہاں ملا؟"

کس قدر معقول بات ہے کہ جزا یا سزا اختتامِ حیات پر کیوں دی جاتی ہے جس سے ان کا اصل مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ کسی جُرم کی پاداش میں سزا اس لئے ہوتی ہے کہ آئندہ زندگی میں اس سے احتراز کیا جائے

اور جزا کے ذریعہ آئیندہ نیک کاموں کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جب رشتۂ حیات ہی ٹوٹ گیا۔ تو جزا یا سزا سے کیا حاصل؟ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نیک آدمیوں کے لئے آئیندہ زندگی موجودہ زندگی سے کہیں زیادہ اچھی ہوگی۔ انواع و اقسام کے فواکہات، لذیذ مفرح مشروبات۔ ایک عمر کی نوجوان دوشیزہ لڑکیاں اور خدا معلوم کیا کیا۔ میر صاحب فرماتے ہیں :۔

"عاقبت میں تمام نعمہائے الہٰی بھی اگر ملیں تو ان حسرتوں کا عوض نہیں ہوسکتا۔ جن کے پورے نہ ہونے کا داغ ہم دل پر لے جائیں گے۔"

اس ضمن میں غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؂

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ۔۔۔ یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"اور حسرتیں تو درکنار صرف دُنیا کو چھوڑنے کا قلق ہزار بہشت پر بھاری ہوگا۔"

روزمرہ کے واقعات میں اس امر کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ انسان خواہ عمر طبعی سے بھی بہت زیادہ عرصہ زندہ رہے۔ مگر اس کی وفات پر اظہار غم ضرور کیا جاتا ہے۔ (میر صاحب نے اپنی عمر کی چھیاسی بہاریں دیکھیں مگر ارباب علم و ادب نے ان کی وفات پر جو ماتم کیا وہ سب پر روشن ہے۔ اور اسی اظہار غم کا شاہد "ساقی" کا "ناصر نمبر" ہے) بعض لوگوں کی بیماریاں اس درجہ اجیرن ہوجاتی ہیں کہ عزیز و اقارب بھی مریض کی موت کے لئے دعا کرتے ہیں۔ مگر جب موت آجاتی ہے تو آہ و بکا بھی ہوتا ہے۔ میر صاحب لکھتے ہیں :۔

"دُنیا سے جدائی کچھ ایسی جاں گسل مصیبت نہیں۔ جبکہ یہ یقین ہو کہ پھر زندگی نصیب ہوگی۔"

دُنیا کے تمام لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد ایک بار ضرور زندہ ہونا پڑیگا۔ خواہ وہ کسی شکل میں ہو مگر یہ محض اعتقاد ہے۔ دل کی تسلّی نہیں ہوتی۔ کامل یقین صرف اسی وقت ہوتا ہے۔ جب کہ ایک چیز تجربے میں آجائے۔

مرنے کے بعد کی زندگی کا ہر شخص کو خیال ہوتا ہے۔ مگر بہت کم لوگ اس امر پر غور کرتے ہیں کہ تخلیق سے پہلے کی زندگی کس طرح بسر ہوئی تھی۔ جبکہ یہ اعتقاد ہے کہ اس دُنیا میں آنے سے قبل بھی ہمارا کچھ نہ کچھ وجود ضرور تھا۔ میر صاحب لکھتے ہیں :۔

"زندگی سے جُدائی کا نام موت ہے۔ مگر پیدا ہونے سے پہلے بھی انسان زندگی سے جُدا تھا اس کا نوحہ کیوں نہیں کیا جاتا۔"

پیدا ہونے سے قبل کا کوئی واقعہ معلوم نہیں ہوسکتا۔ اور آئیندہ کے متعلق یہ قیاس لگایا ہے کہ وہ موجودہ زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہوگا۔ میر صاحب نے کس قدر اچھے طریقہ پر بیان کیا ہے :۔

صحافِ دوجہاں نے ایک رسالہ تین ورق کا ہر انسان کو عطا فرمایا جس کے پہلے ورق پر ایسی

سیاہی سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ کہ آج تک کسی سے پڑھا نہ گیا۔ آخیر کا ورق بالکل سادہ رکھا۔ بیچ کے ورق میں آپ کو اختیار دیا گیا کہ جو جی میں آئے لکھیئے۔ بیچ کے ورق میں جو کچھ آپ لکھیں گے اُس کا عکس حرف بحرف آخیر کے ورق پر اُتر آئیگا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اپنے سے پہلے ہم کیا تھے۔ کیا نہ تھے۔ آخیر میں وہی ہوگا جو ہم زندگی میں کر رہے ہیں۔"

شاید تین ورق کے اسی رسالہ کا نام ذہنِ انسانی نے نامۂ اعمال رکھدیا ہے۔ جو قیامت کے دن ہر شخص اپنے ہاتھ میں لے کر قبر سے نکلے گا۔ یا اسی وقت میدانِ حشر میں ہر شخص کے ہاتھ میں دیدیا جائیگا۔ واللہ اعلم بالصواب وہاں جائینگے تب پتہ لگے گا۔

مرنے والے کے ساتھ ہر شخص کو ہمدردی ہوتی ہے خواہ دوست ہو یا دشمن۔ اور اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس کی ہر آخری آرزو پوری کی جائے امیر صاحب لکھتے ہیں :-

"عمر بھر جو پند و نصائح سُنے جاتے ہیں۔ یاد نہیں رہتے۔ مرتے وقت کی تعمیل فرض سمجھی جاتی ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ اس شخص سے بھی جس کو پھانسی کا حکم دیدیا گیا ہے۔ تختہ پر لٹکانے سے قبل دریافت کر لیتے ہیں کہ تیری آخری آرزو کیا ہے۔ تاکہ اگر ممکن ہو سکے تو اُسے پورا کر دیا جائے۔

زندگی کے اس عہدِ زرین میں جس کو شباب سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو نگاہ کی زد میں آجائے حسین و جمیل معلوم ہوتی ہے۔ اگر درحقیقت کوئی شئے کریہہ المنظر بھی ہے تو ہوا کرے۔ مگر بادۂ شباب کی مسحور کُن رنگینیوں میں ڈوب جانے کے باعث ہر تارِ نظر کا جمال آفریں اعجاز اس میں حُسن پیدا کئے بغیر نہیں رہتا ؎

دُنیا حسین تھی مرے عہدِ شباب میں
ہر چیز پہ بہار تھی ہر شے میں حُسن تھا

اس ضمن میں میر صاحب فرماتے ہیں :-

"عیش میں ہر خیال اس رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے جو ہمارے دل میں ہو۔ اُسکے سامنے گردشِ دوراں کی نہیں چلتی۔"

اُس زمانہ میں دُنیا کا ہر انسان رجعت پسند ہوتا ہے۔ کائنات کا ایک ایک ذرّہ اس کو عیش و آرام اور مسرّت و انبساط میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے۔ کہ صرف پھول کی پنکھڑیاں اس کے لئے جنتِ نگاہ بن جاتی ہیں۔ مگر شاخِ گُل پہ کوئی خار نظر نہیں آتا۔ اس عالم میں اگر کوئی جہاندیدہ انسان اس سرابِ راحت کو بے بنیاد بتائے بھی تو مبتلایانِ عیش کب تسلیم کرتے ہیں چنانچہ میر صاحب بھی اپنے بحرِ شباب پر ہچکولے کھانے والے سفینۂ عشرت میں سے ایک روز فرماتے ہیں :-

"دُنیا کو جو مقامِ رنج کہتے ہیں۔ اس میں مجھے شُبہ ہے مجھے اس میں رنج سے زیادہ خوشی کے اسباب نظر آتے ہیں، یہاں رونے سے کہیں زیادہ ہنسنے کا سامان دیکھ لیجئے .... ہر روز

آنکھیں کھولتے ہی پہلے خندۂ سحر دیکھ لیجئے۔ اور آغازِ شب کو تبسم زا مزاجِ شام کہئے۔ بچپن کے دن ہنسی کھیل کے دن کہلاتے ہیں۔ اور جوانی کے دن کو کیسے ہی گذریں ہنسنے ہنسانے کے دن سمجھے جاتے ہیں۔"

لیکن بہت جلد اس غلط فہمی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور عیش و آرام سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ محض اس لئے کہ وہ دیرپا نہیں ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں:۔

"خوشی کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ جب زوال پذیر ہے تو اس کا نہ ہونا ہی اچھا ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"عیش کی تلاش میں انسان کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ یہ ایک دفعہ نہیں۔ روز کی خودکشی ہے اور اسی لئے بُری ہے۔"

جوانی کے ڈھلتے ہی انسان کی طبیعت رجائیت سے قنوطیت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ کائنات کے وہ ذرّے جو عیش و آرام اور مسرّت و انبساط کا سبب سمجھے جاتے تھے۔ سامان، رنج و الم اور موجبِ غم و اندوہ نظر آنے لگتے ہیں۔ اور عیش و عشرت کی جن چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے بڑی جد و جہد کرنی پڑتی تھی۔ ان سے چھٹکارا پانے کے لئے دعا مانگی جاتی ہے۔ اور میر صاحب بھی یہ کہنے کیلئے مجبور ہوجاتے ہیں:۔

"اس دارِ محن میں اسبابِ عیش بھی رنج کا سبب سمجھئے۔"

بعض حضرات کا خیال ہے کہ میر صاحب اپنی زندگی میں شروع سے آخیر تک رجائیت پسند تھے۔ لیکن مجھے ان سے اختلاف ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں خوش و خرّم رہتے تھے وہ اپنے مخصوص حلقۂ احباب میں عیش و عشرت کا پیغام دیتے تھے۔ لیکن جہاں تک ان کے ادبیات و اقوال کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کا ہر تارِ نفس قنوطیت میں ڈوبا ہوا نکلتا تھا۔ ایک دفعہ نہیں۔ پچاس مرتبہ اُنہوں نے دُنیا کی ناپائیداری اور عیش و عشرت کی بے ثباتی پر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اِن کے بے شمار اقوال ایسے ہیں جن سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے۔ کہ اُن کی نظر میں دُنیا کے اندر سوائے رنج و غم کے کچھ نہ تھا۔ اس جگہ میں کسی قدر اختصار سے کام لونگا۔ میر صاحب لکھتے ہیں:۔

"انسان کی زندگی شبِ ہجراں سے کم نہیں۔"

یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ شبِ ہجر میں عیش و آرام تو درکنار پوری طرح نیند بھی نہیں آتی ہے تمام رات اختر شماری اور کرب و بےچینی میں گذرتی ہے۔ پھر شبِ ہجراں سے انسان کی زندگی کو مشابہ کرنا کیا یہ معنی نہیں رکھتا کہ انسان ہمیشہ رنج و غم کی زندگی بسر کرتا ہے۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"دُنیا میں خوشی کی اُمید اس طرح ہے جس طرح حسینوں سے وفا کا خیال۔"

یہ امر مسلم ہے کہ حُسن اور وفا میں اتنا ہی بُعد ہے جتنا زمین و آسمان میں۔ کوئی حسین باوفا نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ جس طرح حسینوں سے وفا کا خیال رکھنا بے سود ہے۔ اسی طرح دُنیا میں خوشی حاصل کرنے کی اُمید قائم کرنا بیکار ہے۔ اگر یہ شاعرانہ نازک خیالیاں ہیں تو ان کو چھوڑ دیجئے۔ ایک جگہ میر صاحب بالکل واضح طور پر لکھتے ہیں:-

"دُنیا میں مجھے رنج و مصیبت کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی"

اپنے مخصوص طرزِ بیان میں وہ اکثر باتوں کو تمثیلات کے ذریعہ ذہن نشین کراتے تھے۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

"دُنیا میں عیش کے چہرہ پر نقاب پڑی ہوئی ہے۔ کہ کسی کو آج تک عیش کی شکل دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ برخلاف اس کے مصیبت ننگی تلوار کی طرح عریانی میں اپنے جوہر دکھاتی ہے"

ایک دوسری جگہ منقول ہے:-

"اِس سرائے فانی کے دو دروازے سمجھئے، ایک آنے کا۔ دوسرا جانے کا۔ پہلا دروازہ جو آنیکا ہے اُس پر ہر زبان میں لکھا ہے کہ ہرگز خوش نہ ہونا دوسرے دروازے پر جو نکلنے کا ہے۔ اُسپر کندہ ہے کہ غم نہ کرنا"

صرف یہی نہیں کہ دُنیا میں خوشی نہیں ہے۔ بلکہ بعض جگہ وہ مصیبت کو عیش پر ترجیح دے کر اس کو حیاتِ انسانی کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں:-

"میری نگاہ میں مصیبت الہام و وحی کے برابر ہے جس سے پروردگار کی مرضی اِنسان پر آئینہ کی طرح روشن ہو جاتی ہے"

یہ حقیقت ہے کہ تکلیف میں خدا یاد آتا ہے۔ اور انسان کو دوسروں کے دُکھ درد کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ خود مصیبت کے جال میں نہ پھنسا ہو۔ اور دوسروں کے درد کا احساس ہی اوّلین شرطِ انسانیت ہے۔ اِسی لئے میر صاحب مصیبت کو الہام و وحی کا درجہ دیتے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"دُنیا میں ہر مصیبت یہی پُکارتی آتی ہے کہ اس عالمِ کون و فساد میں میرا ہی وجود حق ہے باقی خیر بیت، اِنسان کا آغاز ہی مصیبت و درد میں ہے۔ کہ بچّہ روتا پیدا ہوتا ہے"

پیدا ہونے کے بعد بچّے کے رونے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس دُنیا میں آنے کا اسے رنج ہے۔ کیونکہ اِس کے اندر سوائے مصیبت کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگر خوشی کا شائبہ بھی ہو تو غیر حقیقی ہے۔ صرف مصیبت ہی کا وجودِ حق ہے ؎

کیا دھر بھی ہے سلسلۂ طرّۂ گیسو
جو دل نظر آیا سو پریشاں نظر آیا

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جو لوگ نیک زندگی بسر کرتے ہیں اُن کے لئے عیش و آرام ہے۔ اور بدی کرنے والے مصیبت ہی میں مُبتلا رہتے ہیں۔ مگر میر صاحب اس کے برعکس فرماتے ہیں:۔

"دُنیا میں نیکی اور بدی دونوں میں مصیبت ہے"

مذہبی نقطۂ نگاہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں خوشی اور رنج مساوی مقدار میں پیدا کئے ہیں، ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق خوشی حاصل کرتا ہے، اور رنج سہتا ہے۔ مگر اس عقیدے سے قطع نظر دُنیا کی بیشتر مخلوق مصیبت میں منہمک نظر آتی ہے، میر صاحب لکھتے ہیں:۔

"دُنیا میں اگر خوشی اور رنج دونوں برابر ہیں تو انسان کے حق میں رنج کیوں زیادہ آتا ہے"

اس ضمن میں مجھے ایک قطعہ یاد آگیا۔ شاعر کا نام یاد نہیں رہا ؎

قسمت کیا ہر ایک کو قسّامِ ازل نے — جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بُلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا — غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

اِن تمام مندرجہ بالا منقولات سے ثابت ہوتا ہے کہ میر صاحب پکّے قنوطی تھے۔ میر صاحب کے نظریۂ حیات پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ مگر طوالت کے خوف سے میں اپنا قلم روکنے پر مجبور ہوں۔ ورنہ ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کیلئے

میر صاحب مرحوم کی قبر پر عقیدت کے دو آنسو

(از جناب سید عبدالحکیم صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی علیگ وکیل جھانسی)

آہ! ناصر علی کل تک تیرا وجود۔ تیری ہستی عالمِ رنگ و بُو کے لئے باعثِ صد ناز تھی۔ کل تک ایک عالم تیرے شیریں نغمے سُننے کے لئے گوش برآواز تھا۔ اور آج تو عالمِ اسباب سے مُنہ موڑے اس تودۂ خاک کے نیچے خاموش ابدی نیند سو رہا ہے۔ آہ! اُٹھ اور دیکھ اُن غم زدوں کی حالت جنہوں نے تیرے سوگ میں صفِ ماتم بچھا رکھی ہے۔ تو اُن سب سے بے خبر اپنے اس خاکی محل میں پڑا سُکھ کی نیند سو رہا ہے۔ آہ! کل تک جسکا ایک ایک سانس لطافت کی عطر بیزیوں میں بسا ہوا تھا وہ آج اس تیرہ و تار گڑھے میں دبا پڑا ہے ——— لیکن نہیں! جو ڈھانچ قبر میں پاؤں پھیلائے پڑا ہے وہ ناصر علی نہیں۔ وہ تو اُس جوہر لطیف کا اُترا ہوا لباس ہے جو آج بہشت کی پُرفضا وادیوں میں مصروفِ گلگشت ہے۔

مرنے والے ناصر علی! تیری زندہ دلی۔ تیری لطیفہ گوئی۔ تیری صداقت۔ تیرا خلوص۔ تیری علمیت۔ تیری شفقت زندگی میں دوسروں کے لئے سامانِ انبساط اور باعثِ صد فخر تھی۔ مرنے کے بعد تیری نیکیاں۔ تیری خوبیاں۔ تیری اچھائیاں ہم سب کو نجات کا صحیح راستہ دکھائیں گی۔ تیری لائقِ تعظیم زندگی ہمارے لئے مشعل ہدایت بنے گی۔

آہ! ناصر علی تو اب ہم میں نہیں رہا، تیری ہستی ایک بھولی بسری یاد معلوم ہوتی ہے۔ لیکن تیرے مُتبرک ہاتھوں کی گلکاری صفحۂ ہستی سے مٹنے والی نہیں۔ گلشنِ ادب میں تیرے ہاتھ کے لگائے سدا بہار پھول قیامت تک نہ مُرجھائیں گے۔ تُو نے جو انمول موتی لُٹائے ہم اُنہیں آنکھوں سے لگانا اپنے لئے ایک سعادت خیال کریں گے۔

الوداع! اے لائقِ پرستش انسان الوداع ——— !! تُو نے اپنی طویل عمر میں کسی کو دانستہ صدمہ نہیں پہونچایا۔ یہی ایک بات تیری نجات اور بخشش کا سبب ہے۔ تیرا ازلی مالک۔ تیرا آقا تجھ سے خوش ہے۔ بہشت کے دروازے تیرے لئے کُھلے ہوئے ہیں۔ جا۔ اور ایک نامعلوم مدت تک بہشت کی پُرفضا وادیوں میں گم ہو جا۔

اے پروردگارِ عالم! تُو اُسکے نام کو اچھائی کے ساتھ زندہ رکھ اور ہمیں توفیق عطا کر کہ جس عالی حوصلگی اور نیک نیتی سے اُسنے اپنی زندگی گذاری ہم بھی اپنے دن پورے کرسکیں!

غمزدہ عبدالحکیم،

میر ناصر علی خاں

اے چراغِ بزمِ دوشین کی ضیائے آخری!
گلشنِ دہلی کی اے رنگین صدائے آخری!

آہ! کس منہ سے کہوں تو خاک میں خوابیدہ ہے
سامنے نظروں کے تیرا پیکرِ کاہیدہ ہے

گھل گیا سوزِ دروں سے شمعِ سوزاں کی طرح
رخصت آخر ہو گیا دودِ پریشاں کی طرح

داغ تو اردو کے صد پارہ جگر کو دے گیا
آہ، اپنا رنگ بھی تو ساتھ اپنے لے گیا

فلسفہ اب سادہ تر لفظوں میں سمجھائے گا کون؟
اب بساطِ انجمن پر پھول برسائے گا کون؟

نغمہ بیزار رباب و چنگ ہیں تیرے بغیر
بزمِ اردو مطلقاً بے رنگ ہے تیرے بغیر

اہلِ عالم کو نوا تیری، "صلائے عام" تھی
جنبشِ لب ترجمانِ عقدۂ الہام تھی

گیسوئے اردو کی اب مشاطگی ممکن نہیں
اور سب باتیں تو ممکن ہیں، یہی ممکن نہیں

بزمِ داغ و محفلِ غالب، خیابانِ نذیر
سب کی رونق تجھ سے تھی اے یادگارِ سوز و میر

ذہنِ شاعر کی ودیعت، عشق کے سینے کا راز،
حسن کی پنہاں حقیقت، کیف و کم کا امتیاز،

تھی امین ان سب خزانوں کی تری فکرِ بلند
شوخیاں کرتی تھی بامِ عرش سے جسکی کمند

قلزمِ تحقیق میں بہتا چلا جاتا تھا تو
تہہ سے طوفانوں کی، موتی ڈھونڈ کر لاتا تھا تو

سخت عنوانوں پہ دل میں چبھنے والے حاشیے،
سینکڑوں نظموں سے بہتر، چار ٹکڑے نثر کے

آہ، وہ اردو میں وارفتہ نگاری اب کہاں؟
حسن کی لے ہیں حدیثِ بیقراری اب کہاں؟

اے مسافر! ہو ترا اللہ ناصر، الوداع
اے جہاں آباد کی آوازِ آخر، الوداع

سرور بارہ بنکوی

کچھ بھولی بسری باتیں

(از جناب آغا محمد اشرف۔ بی۔ اے، دہلوی)

سنہ ۱۹۲۸ عیسوی کے اواخر میں خان بہادر میر ناصر علی صاحب مرحوم کے پوتے سید انصار علی صاحب اور راقم اینگلو عربک کالج دہلی میں ساتھ پڑھتے تھے۔ چونکہ ہم دونوں فراش خانہ ہی میں رہتے تھے اور تقریباً تمام مضامین بھی متفق تھے اِس لئے تعلیمی کوائف کے سلسلے میں ہماری راہ و رسم بہت جلد ایک معمولی واقفیت سے گذر کر دوستی کی حدود میں داخل ہوگئی۔

انصار صاحب اپنے دادا جان والے مکان کے بالاخانہ میں مقیم تھے۔ اور اُسکے بالکل برابر والا حصہ میر صاحب کے لئے وقف تھا۔ لیکن اِن دونوں حصوں کا زینہ مشترک تھا۔ اِسلئے انصار صاحب کے کمرہ میں بیٹھ کر میر صاحب والے کمرے کی زیارت ہوجاتی تھی۔ بعض اوقات انصار صاحب کے کمرہ میں جاتے وقت میر صاحب سے مٹھ بھیڑ بھی ہوجاتی تھی۔

انصار صاحب ایک فرمانبردار پوتے کی طرح میر صاحب کا بہت زیادہ لحاظ اور ادب کرتے تھے۔ بلکہ اُن کے آرام کا یہاں تک خیال رکھتے تھے کہ اپنے احباب کو میر صاحب کے سامنے سے گذرنے بھی نہیں دیتے تھے اور اگر کبھی میر صاحب ان کے کمرے کے سامنے ہی آ کھڑے ہوتے تو انصار صاحب یا تو چلمن ڈلوا دیتے یا کمرے کے کواڑ بھیڑ دیتے۔ انصار صاحب کے اس دستور العمل کا اثر لازمی طور پر ان کے احباب پر بھی ہوتا تھا۔ اگر ہم میر صاحب کو زینے سے نیچے اُترتا دیکھتے تو یا تو راستہ میں سے لوٹ جاتے یا اُس تنگ زینے کے ایک کنارے پر مودّب کھڑے ہو جاتے۔

بہرحال ہم جب کبھی انصار صاحب سے ملنے جاتے تو میر صاحب کی ایک آدھ مرتبہ زیارت ضرور نصیب ہوجاتی تھی۔

اگرچہ اُس وقت میر صاحب پیری کی آخری منازل میں داخل ہو چکے تھے۔ لیکن بخوبی چلتے پھرتے تھے۔ البتہ کمر جُھک گئی تھی۔ ایک لڑکا ملازم ہمیشہ اُن کے پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ جس سے یہ باتیں کرتے رہتے تھے۔ جو بہت پُرلطف ہوتی تھیں۔ اگرچہ ان باتوں کا مخاطب صرف یہی ملازم ہوتا تھا۔ لیکن ان میں تمام دُنیا کا تذکرہ اور فلسفۂ معیشت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا تھا۔ اور یہ ملازم بھی کچھ ایسے عادی ہوگئے تھے کہ ہمیشہ خاموشی سے ان کی باتیں سُنتے رہتے اور کبھی سوائے "جی حضور" یا "سرکار" کے جواب تک نہیں دیتے تھے۔

پوشاک کے معاملے میں میر صاحب نہایت بے تکلّف اور سادہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ بازار جاتے

وقت گرمیوں میں اچکن یا کوٹ وغیرہ کبھی پہنے نہیں دیکھا۔ ایک لمبا کُرتہ اور سفید ایک برا پاجامہ پہنتے تھے۔ البتہ سردیوں میں گرم کوٹ پہنتے تھے۔ سہارا لینے کے لئے ہاتھ میں عصا رکھتے تھے۔ اکثر کندھے پر رومال پڑا رہتا تھا۔ سر پر کپڑے کی گول وضع کی ٹوپی ہوتی تھی۔

بازار میں اُترتے ہی تمام دوکاندار ان کو سلام کرتے تھے۔ میر صاحب کی ہر دکاندار سے ملاقات تھی۔ اور تقریباً ہر ایک دکاندار سے چند منٹ باتیں کرنا اِن کی وضعداری میں داخل تھا۔ بعض دکانداروں کے ہاں تو گھنٹوں بیٹھتے تھے۔ دکاندار بھی اِن کے منتظر رہتے تھے۔ میر صاحب ہر ایک دکاندار سے اسکی سمجھ کے مطابق چند باتیں کرکے آگے قدم بڑھ جاتے۔ دکانداروں اور بازار والوں سے باتیں کرنے میں اتنا عرصہ لگ جاتا تھا کہ تقریباً ایک گھنٹے میں بمشکل فراش خانہ کے باہر تک پہنچتے تھے۔ بازار کے اور دکانداروں سے تو صرف صاحب سلامت ہی تھی، لیکن کرم الٰہی صاحب سوداگر سے بہت زیادہ راہ و رسم بڑھ گئی تھی، آتے جاتے گھنٹوں کرسی بچھوا کر ان کی دکان پر بیٹھتے۔ اور اکثر ادبی مباحث پر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ آخری ایام میں جب خود اپنے بالاخانہ سے نیچے نہیں آسکتے تھے تو آدمی بھیجکر کرم الٰہی صاحب کو اپنے مکان پر بلوا لیتے اور گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ ہم نے بازار میں سے گذرتے ہوئے بارہا دیکھا ہے کہ میر صاحب کرم الٰہی صاحب کی دکان کے سامنے بیٹھے غالب کے کسی شعر کی شرح بیان کر رہے ہیں۔ اور اس ایک شعر کی سند میں ہزاروں اشعار پیش کر رہے ہیں۔ افسوس کہ کوئی جوہر قابل اِن نکات سے مستفیض نہ ہو سکا ورنہ پارس ہو جاتا۔

فراش خانہ میں ایک دکان کباڑئے کی بھی تھی۔ اس پر میر صاحب کافی وقت صرف کرتے تھے۔ اور اُس کی پُرانی کتابیں دیکھتے رہتے تھے۔ شام کو جب تک کہ ہمت رہی روزانہ جامع مسجد تشریف لے جاتے تھے، اور جامع مسجد کے شمالی رُخ والے کباڑیوں کی دکانوں پر کئی کئی گھنٹے بیٹھتے تھے۔ یہ لوگ بھی سمجھ گئے تھے کہ میر صاحب کو پُرانی چیزیں خریدنے کا شوق ہے۔ اِسلئے بہت کوشش سے پُرانی کتابیں اور پُرانا سامان وغیرہ جمع کرکے لاتے تھے اور مُنہ مانگے دام پاتے تھے۔ انصار صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کی پنشن کی ایک معقول رقم اِن کباڑیوں کی نذر ہو جاتی تھی۔ اب بھلا کباڑیوں کو ایسا قدردان کہاں مل سکتا ہے؟ میر صاحب کے جامع مسجد پر پہنچتے ہی کباڑیوں میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا تھا۔ ہر دکاندار میر صاحب کو اپنی دکان پر بلاتا کہ "نواب صاحب۔ یہ دیکھئے آپ کے واسطے میں نیا مال لایا ہوں" دوسرا چلاتا "ڈپٹی صاحب ایسی چیز آپ کی نظر سے نہیں گذری ہوگی" میر صاحب مُسکرا مُسکرا کر سب کو جواب دیتے اور بہت شوق سے اُن کی پُرانی چیزوں کو دیکھتے اور لیجاتے۔ چنانچہ میر صاحب والا مکان ایک مستقل "عجائب گھر" بن گیا تھا۔ جس میں کتابوں کا تو خیر کوئی ذکر ہی نہیں۔ دوسری پُرانی چیزیں اس قدر کثرت سے موجود تھیں کہ کوئی شخص بادی النظر میں اسے رہائشی مکان تصور نہیں کرسکتا تھا۔

کتابوں کے مطالعہ کا میر صاحب کو آخر دم تک شوق رہا۔ آپ کی لائبریری اس قدر وسیع تھی کہ اس میں ہر شعبۂ علم پر متعدد تصانیف موجود تھیں۔ اور پھر یہی نہیں کہ میر صاحب صرف کتابیں جمع ہی کرتے تھے بلکہ ہر کتاب کو نہایت غور سے پڑھتے تھے۔ اور سرخ پنسل سے پسندیدہ مقامات پر نشان لگاتے جاتے تھے۔

میر صاحب کو انگریزی علم و ادب کا بہت شوق تھا۔ تمام مشہور انگریزی انشا پردازوں کی تصانیف اُن کی نظر میں تھیں۔ بعض اوقات انصار صاحب سے خوش ہوکر کچھ کتابیں انہیں بھی دیدیا کرتے تھے انہیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کس وقتِ نظر سے ان کا مطالعہ کرتے تھے۔

میر صاحب نوجوانوں کو ذرا اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اسی لئے انصار صاحب کے احباب ان کے سامنے آتے ہوئے کتراتے تھے۔

ایک روز ہم پانچ چھ احباب انصار صاحب کے کمرہ میں بیٹھے تھے کہ ملازم نے میر صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔ انصار صاحب نے حسبِ معمول کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ لیکن اتفاقاً اُس روز ہم سب کی جوتیاں کمرے سے باہر پڑی رہ گئیں۔ میر صاحب کمرے کے آگے آکر ذرا ٹھٹکے اور فرمانے لگے:۔

"دیکھو۔ صاحبزادے اپنے باپ دادا کی کمائی کس بُری طرح خرچ کر رہے ہیں کہ صرف اپنے استعمال کے لئے دس جوڑے جوتیوں کے رکھے ہیں"

ہم سب کمرے میں اس فقرے کو سُنکر پھڑک گئے۔ لیکن انصار صاحب نے اشارے سے ہنسنے کو منع کر دیا۔

میر صاحب کو چاء پینے کا بہت شوق تھا۔ اور یہ خصوصیت ورثہ میں انصار صاحب کو بھی ملی ہے، جب کبھی انصار صاحب سے ملنے جائیے چاء ضرور پلا دیتے ہیں۔ اِسی طرح ایک روز شام کو یارانِ طریقت کا مجمع تھا۔ اور چاء کا دَور چل رہا تھا۔ اُسی روز سب کی صلاح سے یہ محفل میر صاحب والے بالاخانہ کے صحن میں منعقد ہوئی۔ میر صاحب کے کمرے کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہو گیا۔ کاغذوں اور کتابوں کے انبار چاروں طرف لگے ہوئے تھے۔ ایک میز پر کچھ مسودات رکھے تھے۔ میر صاحب خود جامع مسجد تشریف لے گئے تھے۔ اِسلئے میدان صاف تھا۔ یاروں نے خوب ہی تو لُطف اُٹھائے۔ ابھی چاء کا دَور چل ہی رہا تھا کہ ایک ملازم نے جسے انصار صاحب نے اسی خدمت پر مامور کر دیا تھا۔ خبر سُنائی کہ میر صاحب غریبخانہ میں داخل ہو چکے ہیں، تمام مجمع میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ لیکن انصار صاحب نے کہا "میر صاحب آدھ گھنٹے سے پہلے مکان میں داخل نہیں ہو سکتے" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ چاء کا دَور نہایت اطمینان سے ختم ہوا۔ تمام سامان اُٹھوا دیا۔ پھر کہیں جاسوس نے خبر دی کہ میر صاحب مکان سے پچاس قدم کے فاصلے پر کسی دکاندار سے باتیں کر رہے ہیں۔ اس عرصہ میں مطلع صاف ہو چکا تھا۔

آخر میں مجھے ایک پُر لُطف واقعہ اور یاد آگیا، جب میں اُسے یاد کرتا ہوں تو ہنسی کے مارے لوٹ جاتا ہوں۔ قارئین

کی دلچسپی کے لئے اُسے بھی لکھے دیتا ہوں۔

اپریل ۳۱ء میں فراش خانہ میں مُرغ بازوں کا ایک آل انڈیا قسم کا اجتماع تھا۔ جس میں امروہہ۔ مرآد باد۔ شاہجہانپور اور لکھنؤ وغیرہ سے بڑے بڑے مرغ باز مقابلے کے لئے آئے ہوئے تھے، اگرچہ اُس زمانہ میں ہمارا انٹرمیڈیٹ کا امتحان ہو رہا تھا۔ لیکن یاروں نے کہا کہ ایسے موقعے روز روز ہاتھ نہیں آتے۔ اِسلئے اِس مرغ بازی کے ٹورنامنٹ کو ضرور دیکھا جائے۔ چنانچہ ہم چند احباب (جن میں انصار صاحب بھی شامل تھے) موقعۂ واردات پر جا پہنچے۔ وہاں ایک عظیم الشان اژدہام کے سامنے مرغ باز حضرات اپنے اپنے مرغوں کی نمائش کر رہے تھے۔ لیکن لڑنے والے مرغوں کے لئے "پانی مانگا جا چکا تھا" اِس لئے نیا مقابلہ شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ ہم نے جانا چاہا تو ایک چودھری صاحب نے ازراہ عنایت فرمایا کہ آپ تشریف لے جائیے۔ جب لڑائی شروع ہوگی تو میں آپ سبکو بلا لونگا۔ چنانچہ چودھری صاحب نے ہمارا گھر دیکھنے کے لئے ایک لڑکا ساتھ کر دیا۔

ہم سب انصار صاحب کے کمرے میں جا بیٹھے۔ اور باتوں میں کافی وقت گذر گیا۔ اتنے میں میر صاحب مرحوم اپنے کمرے سے نیچے زینے میں اُتر رہے تھے کہ چودھری صاحب کا پیغامبر ہمارا بُلاوا لے کر آ پہنچا اور بجائے ہمارے میر صاحب کو مُرغ بازی کے ٹورنامنٹ میں چلنے کی دعوت دی۔

اول تو میر صاحب اُس کی بات نہیں سمجھے۔ لیکن جب اُس نے نہایت وضاحت سے "آل انڈیا مرغ بازی" کا تذکرہ کیا تو میر صاحب سمجھ گئے کہ یہ سب شرارت انصار صاحب اور اُن کے احباب کی ہے جنہیں بُلانے کے لئے یہ پیغامبر آیا ہے، بس پھر کیا تھا۔ باہر سے ہی ہم پر وہ بوچھاڑ کی کہ ہمیں خوف کے مارے کمرے کے کونوں میں چھپتے ہی بن پڑی۔

افسوس دہلی کی یہ بزرگ ہستی بھی اب ہم میں نہیں رہی جس کی زندگی سے اُردو لٹریچر کی زندگی تھی۔ اب اُنکے لائق پوتے انصار صاحب کے صحیح مذاق انشا پردازی کو دیکھتے ہوئے ہمیں توقع ہوتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں اُن کے جانشین ثابت ہو کر کسی حد تک اِس نقصانِ عظیم کی تلافی کر دینگے۔

آہ! میر صاحب مرحوم

(از جناب میرزا محمد بشیر بی۔اے)

دیدۂ خونبار تھا مدت سے و لےآج ندیم — دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے (غالب)

اللہ اللہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کیسی کیسی صورتیں خاک میں "پنہاں ہوگئیں"۔ سوچتا ہوں کہ اگر یہی صورتیں کچھ لالہ و گل میں "نمایاں" ہوتیں، تو میں میر صاحب کو کہاں ڈھونڈھوں۔ گلوں میں؟ نہیں۔ دل کہتا ہے لالوں میں۔ اُن کو اُردو سے ازلی عشق تھا جو اُن کے ساتھ گیا۔ بقول میر ؏ میں ساتھ زیرِ خاک اک ہنگامہ لے گیا۔ وہ عشق داغ بنکر لالہ میں ہوگا۔ انکی دلی تمنا یہ تھی کہ نثرِ اُردو سنور جائے وہ خون بنکر لالہ سے ٹپکے گی۔

اُردو کے چاہنے والو! میر صاحب کی ہستی ہمارے لئے ایک پیغام لائی تھی۔ وہ پیغام یہ تھا کہ اب ہم اُردو نثر کی خدمت کریں۔ اِس چمن کی آبیاری کریں اور ایسے پودے لگائیں جو اب تک نہ لگے ہوں، جو پھل پھول رہے ہوں اُن پر ایسا ریاض کریں کہ سارا گلستان لہلہا اُٹھے۔ "صلائے عام" شاہد ہے کہ کس سرگرمی سے اُنھوں نے نثر کی خدمت کی ہے۔ ہمیشہ وہ اس بات کے کوشاں رہے اور جد و جہد کرتے رہے کہ ملک عروجِ نثر کی طرف مائل ہو۔

میر صاحب جس پایہ کے نثر نگار تھے اُس کی مثال آج ممکن نہیں۔ ایک خوش مذاق مُبصّر اور سخن فہم نقّاد کا ماتم جس قدر بھی ملک کرے کم ہے۔ اُن کے ادبی ذوق اور علمی جستجو کا یہ عالم تھا کہ دُنیا کے مختلف ادبوں کی سیر کرتے۔ چمن چمن پھرتے اور گلہائے رنگا رنگ سے بزمِ اُردو کی رونق بڑھاتے۔ پھر قسّامِ ازل نے اُنکو ایسا صحیح مذاق عطا کیا تھا کہ بے شمار اُردو فارسی کے بے نظیر اشعار یاد تھے اور کمال یہ تھا کہ جس موقعے اور جس محل پر جو شعر پڑھا یا لکھا معلوم ہوا کہ اُسی کے لئے وہ اُترا تھا۔ یہ صفت ہم نے کہیں اور میں نہ دیکھی۔ بقول آتش:۔ ؎

جامہ زیبی ترے اندام کے اوپر ہوئی مختتم
تمکو پہنا کے جو انداز قبا کا دیکھا!

میر صاحب کا "سادہ پُرکار" طرز، شگفتہ بیانی، جذبات کی حقیقی ترجمانی، گوناگوں جذبات کا دلکش انکشاف، اور زمانہ کی رنگارنگی کی بولتی چالتی تصویریں نثرِ اُردو کے کارنامے ہیں۔ ان کی تحریروں میں کہیں کہیں شوخیاں اور رنگینیاں بھی ہوتی ہیں جو دلوں میں حسینوں کی اداؤں کی طرح ہمیشہ چٹکیاں لیتی ہیں۔ ہر جملہ اُنکا بس قیامت کا فتنہ ہے سانچہ میں ڈھلا ہوا۔ جارج مور (George Moore) نے کیا خوب کہا کہ ایک خیال جو آج میرا ہے کل تمہارا ہے اور پرسوں ساری دُنیا کا لیکن ایک اچھا جُملہ اُسی کی ملکیت ہے جس نے

اُسے کہایا لکھا۔ میر صاحب کا ہر جملہ اُن کی "ملکیت" ہے جو اُن کی شہرت کو بقائے دوام بخشتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میر صاحب کیا اُٹھ گئے شباب کی پُر کیف داستانیں اور ضعیفی کی پُر درد رُوداد سُننے کا لُطف اُٹھ گیا۔ وہ لوگ جنکو اُردو کا صحیح مذاق ہے اُن سے کوئی پوچھے کہ ع:-

"مرنا یہ کس کا جان سے بیزار کر گیا"

جو صدمہ دل پر ہوا بیان نہیں ہوسکتا:- ؎

جراحتے بجز این نیست آشنایانِ را
کہ آشنائی وبیگانہ وارمی گذری! (خسرو)

پاکیزہ لٹریچر کی کتابیں

کولتار- اسکے بعض حصے ہنسانے والے، بعض رُلانے والے اور بعض نہایت پُراسرار ہیں۔ قیمت ۶ر

ویمپائر- ایک دوشیزہ کی عصمت ریزی کا عجیب وغریب دردانگیز ومضحکہ خیز قصہ۔ قیمت ۶ر

شریر بیوی- ایک شوخ وشنگ لڑکی کی داستان جس کو پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ قیمت ۸ر

فل بوٹ- حُسن وعشق کا بے حد دلچسپ مختصر ناول۔ جذبات وتاثرات کا دلآویز مُرقع۔ قیمت ۸ر

روحِ ظرافت- صحیح معنوں میں ظرافت کی روح ہے۔ آٹھ نہایت دلکش افسانوں کا مجموعہ قیمت ۸ر۔ مجلد ۱۲ر

روحِ لطافت- جذباتِ لطیف کی روح ہے۔ آٹھ بیحد دلچسپ وعبرت انگیز افسانے۔ قیمت ۸ر۔

مرزا جنگی- لکھنؤ کی پُرانی تہذیب اِس دلاویز ڈرامے میں دیکھکر ہنستے ہنستے لوٹ جایئے۔ قیمت ۱۲ر

چینی کی انگوٹھی اور لوٹے کا راز- ایک جج صاحب کی ہنسانے والی سرگذشت اور ایک خاتون کی دردانگیز سوانح حیات کا پُرلطف افسانہ۔ قیمت دیکھا جائیگا۔ شائقین کے بیحد اصرار پر کتابی صورت میں شایع کیا گیا۔ خوبصورت مضبوط جلد۔ قیمت ۱۰ر

جنت کا بھوت- یہ افسانہ بھی اس قدر پسند کیا گیا کہ اس کو کتابی صورت میں شائع کرنا پڑا ہے۔ قیمت ۱۲ر

تفویض- ایک گریجویٹ خاتون کی شادی ایک مسجد کے مُلا سے ہوجاتی ہے اُسکے عجیب وغریب نتائج۔ قیمت ۵ر

قرآن اور پردہ- آیات قرآنی کے حوالوں سے بتایا گیا ہے کہ صحیح پردہ کیا ہے اور رسمی پردہ کیا بن گیا ہے قیمت ۸ر

حدیث اور پردہ- صحیح احادیث کے حوالوں سے پردہ کی حقیقت بیان کی گئی ہو نہایت ضروری کتاب۔ قیمت ۱۰ر

رقص وسرود- مسلمان لڑکیوں کے لئے رقص وسرود کی تعلیم کس قدر ضروری ہے؟ مذہبی رو سے اسکا جواز۔ قیمت ۴ر

نجمہ نوری- ماں کی مامتا سے متعلق ایک دلدوز تمثیل جسکو پڑھکر آپ اپنے آنسو نہ روک سکیں گے۔ قیمت ۱۲ر

چندرا موہنی- حُسن وعشق کی داستانِ جگر پاش۔ محبت کے لطیف جذبات کا حسرتناک انجام۔ قیمت ۱۰ر

ملنے کا پتہ:- ساقی بکڈپو دہلی

"اُردو نثر کا آخری ستارہ"

(از جناب سیّد وقار عظیم - بی - اے)

جب آزاد اس دُنیا سے سدھارے تو شبلی نے کہا کہ آج اُردو انشا پردازی کا آفتاب غروب ہوگیا۔ خود شبلی بھی نہ رہے اور اُردو یتیم ہوگئی۔ حالی نے بھی دلوں کو داغ دیا اور اُردو کا کوئی والی نہ رہا۔ مہدی حسن افادی مرحوم کی زندگی میں اِن سب کی یاد دلوں کو شگفتہ کرتی رہتی تھی مگر وہ بھی نہ رہے۔ اُردو کے سچے فدائی اب چراغ لے کر بھی ڈھونڈھے جاتے تو شاید ہی ملتے۔ دلّی صرف ایسی جگہ تھی جو اس حالت میں بھی فخر کرسکتی تھی کہ ابھی اُس میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی ذات اُردو کے لئے سرمایۂ ناز سمجھی جاسکتی ہے۔ لیکن افسوس کہ اب دلّی بھی اپنے آپ پر فخر نہیں کرسکتی۔ میر ناصر علی مرحوم کی ذات ہی صرف ایسی تھی جنہوں نے آزاد۔ شبلی۔ حالی۔ اور مہدی حسن کے بعد بھی گیسوئے اُردو کو منت پذیر شانہ سمجھا اور اُس کے سہاگ کو قائم رکھنے کی قابل قدر کوششیں کیں۔ ستّر برس تک اِن سُونی بزموں میں ایک درخشندہ شمع کی طرح چمکے۔ لیکن افسوس کہ آج اُردو کی محفلیں سونی اور بے رونق ہوگئیں، روشنی ظلمت سے بدل گئی۔ ایک چراغ سحری ٹمٹما رہا تھا اُسے بھی بادِ ایام کے ناموافق جھونکوں نے ہمیشہ کے لئے خاموش کردیا۔

میر صاحب مرحوم نے ستّر برس کے قریب اُردو کی جو لگاتار خدمت کی اُسے اُردو کبھی آسانی سے فراموش نہیں کرسکتی۔ "صلائے عام" کے علاوہ مُلک کے دوسرے ادبی رسالوں میں بھی وقتاً فوقتاً بیش بہا مضامین لکھتے رہے، جن کی تعداد اس وقت گنتی سے زیادہ ہے۔ آخر عمر میں بے حد کمزور ہوگئے تھے لیکن اردو کی محبت ایسی نہیں تھی کہ اسے اتنی جلدی بھول جاتے۔ برابر اس سلسلہ کو جاری رکھا۔ اُن کی تحریریں مردہ دلوں کے لئے ایک شگفتگی کا سامان رہیں۔ اُمید اور شگفتگی کی خوش کُن جھلک اُن کی تحریروں میں قدم قدم پر موجود ہے۔ لیکن افسوس کہ آج اُس شگفتگی نے ہمیشہ کے لئے پژمردگی کی صورت اختیار کرلی۔

مہدی مرحوم نے شبلی کی پُرسحر نثر سے متاثر ہوکر کہا تھا کہ غالب مرحوم زندہ ہوتے تو شبلی کو اُن کی اُردوئے خاصہ کی داد ملتی۔ میں میر صاحب کی شگفتہ نثر کو دیکھ کر یہی کہنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ اُن کی نثر میں وہ تمام جوہر موجود ہیں جنہوں نے شبلی کی نثر کو اُردوئے خاصہ بنایا۔ وہ صحیح معنوں میں انشا پرداز ہیں، اُن کی عبارتوں میں پیچ نہیں۔ وہ ہر بات کو نہایت سیدھے سادے اور شگفتہ طریقے سے کہنے کے عادی ہیں۔ وہ تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال کرتے ہیں لیکن نفس واقعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اُن کے خیالات میں بھی حُسن ہے اور الفاظ کے صحیح انتخاب میں بھی۔ اُن کی عبارتیں جہاں ایک طرف آزاد کی طرح رنگین اور مسرت افزا ہیں وہاں شبلی کی طرح شگفتہ اور مدلّل بھی۔ لیکن اِن باتوں کے باوجود بھی بات کو آسان

سے آسان زبان میں پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا جہاں دل و دماغ سے اُس کی شگفتگی اور علمیت کا لطف اُٹھائے وہاں دوسری طرف دوسرے حواس بھی اُس کا برابر مزا لے سکیں۔ زبان اور کان ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ نیا حُسن اور لطف محسوس ہو۔ بات آسانی سے سمجھ میں بھی آجائے اور اُس کے حُسن اور علمیت میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔ ایک جگہ اہلِ سخن کو مخاطب کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نہایت محبّت سے باتیں کر رہے ہیں۔ سلاست۔ روانی۔ شگفتگی سب کچھ موجود ہے۔

نظم میں کوئی بات باقی نہیں رہی۔ جو آپ دکھا سکیں۔ جتنے اگلے کہہ گئے اس سے زیادہ کیا اس کے برابر بھی کہنا مشکل ہے اور اگر کہا جائے اور قواعد کی پابندیاں ترک کی جائیں تو عوام کی تو میں نہیں کہہ سکتا مگر اس فن کے جاننے والے ہنستے ہیں۔ نظم کی جگہ آپ نثر میں محنت کریں کہ اس میں پابندیوں کی شرط نہیں۔ ردیف و قافیہ بحر و وزن کا جھگڑا نہیں۔ زلفِ جاناں سے بڑا مضمون ہو اور دہنِ یار سے چھوٹا ہو تو کوئی عیب نہیں۔

ابوالفضل کی عبارت دیکھئے کہ کتنی دور جا کر مطلب نکلتا ہے اور شیخ سعدی کتنی جلدی اپنا مطلب ادا کر دیتے ہیں۔ طاہر وحید کے رقعات اور رقعات عالمگیری ملائیے تو کتنا فرق نکلے گا۔ مگر دونوں معتبر طرزِ تحریر ہیں۔ انہیں اپنی اپنی وضع میں لاجواب سمجھئے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ کی ادائے بیان میں بے گانگی نہ آنے پائے۔ میں نے دیکھا کہ تذکرہ اور تاریخ کی جگہ اب ایک نیا نام نکلا ہے۔ کسی کا تذکرہ یا تاریخ لکھتے ہیں تو اُس کا نام سوانح عمری رکھتے ہیں۔

سوانح دراصل سانحہ کی جمع ہے۔ سانحہ کے معنی صدمہ اور مصیبت کے ہیں۔ محض مصیبتوں اور صدموں کی تفصیل لکھنی ہو تو سوانح لکھنا درست ہے۔

حتی الامکان بیگانہ لب و لہجہ سے احتراز ہو سکے تو اچھا ہے کہ اپنی زبان غیر کی زبان نہ سمجھنی چاہیئے۔ غیر زبانوں کے محاورے اُردو میں ترجمہ نہ کئے جائیں۔ میرا بس چلے تو محاوروں میں اُردو کو عربی۔ فارسی۔ محاوروں سے بچانا اچھا ہے اُردو میں جہاں تک ہو سکے ہندی کے محاورے جو ہر ایک کی زبان پر ہیں۔ زیادہ زیب دیتے ہیں۔"

بیان میں کس قدر فصاحت۔ سلاست اور روانی ہے۔ جو بات اہلِ سخن سے کہنا چاہتے ہیں اس کے لئے لہجہ اور طرزِ بیان کس قدر شیریں ہے۔ غالب کا شعر ہے ؎

نہ کہو گر بُرا کرے کوئی نہ سُنو گر بُرا کہے کوئی

اس پر عام طور پر یہ اعتراض ہے کہ نصیحت کے لئے جو لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے وہ شیریں اور دلکش نہیں۔ نصیحت سُننے والا نصیحت پر عمل کرنے سے پہلے کسی طرح اس بات پر بھی آمادہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس نصیحت کو ٹھنڈے دل سے سُن ہی لے۔ لیکن ممبر صاحب کہتے ہیں کہ حتی الامکان بے گانہ لب و لہجہ سے احتراز

کیا جائے تو اچھا ہے"، یا "اُردو کو عربی۔ فارسی محاوروں سے بچانا اچھا ہے"۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ وہ دوسروں کو اپنی رائے پر عمل کرنے پر مجبور کردیں۔ وہ ایک ناصح مشفق کی طرح صرف ایک بات بتا کر الگ ہوجاتے ہیں۔ مگر الفاظ ایسے ہیں جس سے سُننے والے کے دل۔ ضمیر اور کان کو ٹھیس نہ لگے۔ اِن محاسن کے باوجود نہ عبارت اتنی طویل ہے کہ پڑھنے والا اُکتا جائے۔ اور نہ اتنی مختصر کہ مطلب ہی سمجھ میں نہ آئے۔ اختصار صرف اتنا ہے جو پڑھنے والوں کے اشتیاق کو دونا کردے۔ دل اور زیادہ پڑھنے کے لئے بے چین ہونے لگتا ہے۔

عموماً رنگین اور شگفتہ تحریروں کا خاصہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنی رنگینی۔ شگفتگی اور لطافت یا دوسرے الفاظ میں شاعرانہ تخئیل اور زیب وزینت کے لئے پسند کی جاتی ہیں۔ اُنہیں لوگ صرف اس لئے پڑھتے ہیں کہ زبان تھوڑی دیر اُس کے چٹخارے لے۔ دل اس سے کچھ دیر لُطف اُٹھائے اور بس۔ دماغ اور روح اُس سے کوئی خاص اثر نہیں لے سکتے۔ اس کی وجہ محض یہ ہوتی ہے کہ کلام کی ظاہری زیب وزینت۔ الفاظ۔ محاوروں اور جملوں کا حُسن ترتیب۔ رومانی تشبیہ اور استعاروں کا اجتماع اور خوش نُما تمثیلوں کے سحر آگیں مرقعے جنہیں دیدہ زیب رنگوں سے بھرا جاتا ہے کلام یا عبارت کے باطن اور اُس کی روح کو نظروں سے پوشیدہ کردیتے ہیں۔ آزاد کی تحریریں نثر میں ایک دلکش شاعری کی بہترین مثال ہیں، اُن میں بلند سے بلند خیال بھی ہیں لیکن اکثر اوقات دل اور آنکھیں اپنی دلبستگی کے سامان میں اِس قدر منہمک ہوجاتے ہیں کہ دماغ اور روح کے لئے اُن میں کم ازکم تھوڑی دیر تک کوئی حُسن یا لُطف باقی نہیں رہتا۔ لیکن میر صاحب مرحوم نثر میں شعر کہتے ہیں، مگر ایک ادیب کی طرح وہ اپنے مقصد کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ دُنیا کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں تو اُس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:-

"دُنیا کو جتنی مُشابہت میکدے سے ہے اتنی کسی سے نہیں۔ جس طرح مستوں کی کوئی حرکت سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کی ساری باتیں نرالی دیکھیں اس کا کارخانہ ہی مثل وضع مستان عجیب ہے ؎

مرنجاں اے شیخ ازمن گر سخن بے پردہ می گویم کہ ایں بے پردہ گفتنہا ز تاثیر خرابات است

ذرا سر اُٹھائیے تو ایسا خُمخانہ بے ستون دیکھئے جس میں ایک ساغر واژگوں رات دن چل رہا ہے، گردن جُھکائے تو زیر قدم ایک اور ہی عالم سکوت دیکھئے کہ اس طرف تو نعرۂ مستانہ ہے اُدھر چُپ لگ رہی ہے، یہ اپنے حال میں مست ہیں تو وہ مدہوش پڑے ہیں۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں، یہ اُن کی تو وہ اِن کی نہیں سُنتے"

صبر و استقلال پر مضمون لکھتے وقت دُنیا کے رنج و راحت کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں وہ اپنے مخصوص رنگ میں اِس طرح کہتے ہیں:-

"دُنیا کے رنج و راحت آس و یاس یہ جو مکھی پروا پچھوا ہوائیں جو زندگی کی کشتی کھے رہی ہیں، یہاں تک کہ اِس بحر بے پایاں کا کنارہ نظر آئے۔ بنارس کے جلاہے جو گلبدن و کمخواب بنتے ہیں اُن کا تانا بانا ریشم کا ہوتا ہے۔ جو گزی گاڑھا بنتے ہیں اُن کا تانا بانا سوت کا ہوتا ہے مگر بننے کی نلی

ایک سی ہوتی ہے جو سوئی کہ قاقم و سنجاف بُننے میں کام آئے، اگدڑی کے پیوند لگانے میں بھی وہی کام آتی ہے۔"

تشبیہوں کا انتخاب کس قدر سامنے کا ہے۔ ہر شخص کی نظر ان چیزوں پر رہتی ہے۔ اس لئے میر صاحب بھی اُنھیں کا استعمال کرتے ہیں تاکہ خیال آسانی سے ذہن نشین ہوسکے۔ الفاظ کا انتخاب بھی کس قدر شیریں ہے۔ انگریزی، فارسی، اور عربی سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود بھی ان زبانوں میں سے کسی کے ایسے الفاظ موجود نہیں جو کانوں کو بُرے لگیں یا عبارت کی روانی اور فصاحت میں کمی آجائے۔ بھاشا کے میٹھے اور موزوں لفظوں کو ہر جگہ ترجیح دی گئی ہے۔ لُطف یہ ہے کہ مضمون علمی ہو یا ادبی۔ خالص رندانہ ہو یا صوفیانہ۔ فلسفہ سے متعلق ہو یا شاعری سے ہر چیز میں طرزِ بیان کا وہی حال ہے۔ یہی زبان ہر چیز کے بیان کرنے کے لئے استعمال کی گئی اور بے تکان ہر مشکل سے مشکل خیال نے اِن لفظوں کا جامہ پہن لیا۔ تمثیلوں کا رواج یورپ میں فنونِ لطیفہ کے ہر شعبہ میں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ فارسی اور عربی میں بھی روم مصر اور یونان کا اثر پڑا۔ اِس لئے اُردو شاعری میں بھی جا بجا اس کی جھلک موجود ہے۔ لیکن اُردو نثر میں اس کی مثالیں آزاد سے پہلے کہیں نہیں۔ آزاد نے اس طرزِ تحریر کو معراج بخشی۔ کہیں کہیں میر صاحب کے یہاں بھی یہ اثر موجود ہے۔ زیادہ نہیں لیکن جہاں ہے بے حد لطیف ہے۔ عروسِ سُخن کی حالت کو تمثیل کا جامہ پہنایا ہے۔

"شب آخیر میں تم میرے ساتھ اُس گلی تک ذرا چلو جسے اگلے کوچۂ فصاحت کہتے تھے۔ میں تمہیں اُس ٹوٹے مکان میں لئے چلتا ہوں جہاں سے شمع کی وہ دھندلی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آوازوں کے شور سے کان پڑی بات نہیں سُنائی دیتی تھی۔ اب تم اپنے ہی دل کے دھڑکنے کی آواز سُن لو۔

اس وقت کی حالت جی میں سمجھ لینے کی ہے کہ سارا جہاں تو بے ہوش پڑا سو رہا ہے سنسان کا عالم ہے، اس میں ایک نازک اندام کرب میں کراہ رہی ہے ....

گرتے پڑتے ہم دروازے تک پہونچے۔ دیکھا تو ایک کریہہ منظر بُری شکل کا آدمی اندر سے نکلتا ہے جس کے بدن پر تمام جُھریاں پڑ رہی ہیں۔ چہرہ پر نہایت سختی برستی ہے اور آنکھوں سے خون ٹپکتا ہے۔ ہم کو دیکھ کر یہ کچھ تیرا تا سا چلا گیا .... اندر جاکر دیکھتے ہیں کہ یہ غضب کی مہ پارہ جس کی عمر بارہ تیرہ سے زیادہ نہیں۔ عشق میں ادھر اُدھر کروٹیں بدل رہی ہے ...."

اب تک جتنے نمونے پیش کئے گئے اُن میں سے اکثر میں اور خصوصیات کے علاوہ رنگینی اور تیکھا پن زیادہ نُمایاں تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میر صاحب کی تحریروں پر یہ اثر بہت گہرا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کی نُمایاں خصوصیت ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُن کے ہر لفظ سے ادبیت اور علمیت ٹپکتی ہے کوئی بات اگر شاعرانہ ہے تو اُس کا بیان مدلل لیکن شگفتہ اور رنگین ہے۔ دِل کے خطروں کا ذکر

کرتے ہیں۔ درمیان کا ایک ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے جس سے اُن کی خصوصیات کا یہ اہم پہلو بھی بالکل روشن ہوجائے گا۔

"انسان کو جب عقل آتی ہے تو ہر بات میں دلیل و حجت پر زور دیتا ہے جو بات عقل سے ثابت نہیں یا نہ ہوسکے آنکھیں بند کرکے اُس کے پیچھے پڑجاتا ہے۔ کوئی مسئلہ آپ زبان سے نکالیئے۔ سُننے والے کے مُنہ سے چھوٹتے ہی یہی نکلے گا کہ پہلے ثابت کیجئے...... نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ اور ایک کے بعد دوسرے کی تردید ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اور تو اور اپنی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر کو نہ آپ اپنی سُنتے ہیں اور نہ میری۔"

موت کا ذکر کرتے ہیں تو علمیت کا یہ عالم ہے کہ موت کے وہ تمام نظریئے جو مذہب۔ تصوّف۔ اور شاعری سے متعلق ہیں صرف چند سطروں میں لکھ دیتے ہیں۔ عرب۔ یونان، روم۔ مصر اور انگلستان کے فلسفی اور دُنیا کے تمام مذہب موت کو جن جن ناموں سے پُکارتے ہیں یا جن جن شکلوں میں پیش کرتے ہیں انھیں بہ نہایت دلچسپ اور لطیف طریقہ سے بہت تھوڑی سی جگہ میں تفصیل سے بیان کردیتے ہیں۔ اللہ رے علم۔ اور لُطف یہ کہ طرزِ بیان میں وہی شگفتگی و رعنائی۔ لطافت اور بیکھاپن۔

"محشرِ خیال" ایک شاعرانہ مضمون ہے اس لئے پیرایہ مدلّل سے زیادہ شاعرانہ ہے۔ آدم۔ ارضی۔ دانش مرزا طاہر۔ ظہوری۔ بیدل۔ مرشد اور عزت کے تجربات کو اس طرح پیش کیا ہے جیسے خود دیکھی ہوئی چیز ہو۔ شاعری اور فلسفہ نے ایک شکل اختیار کرلی۔ اللہ رے حُسن...... لیکن زیادہ حیرت اُس وقت ہوتی ہے جب فلسفی اور شاعر نثار اپنی تحریروں میں مزاح کی چاشنی ملا دیتا ہے۔ اِس قندِ مکرر میں بھی اتنا ہی لُطف ہے جتنا اُس کے مدلّل اور شاعرانہ نثر میں۔ نثر کے اِس رو پہلے اور چمکدار چشمے میں بجلی کی ہلکی سی لہر جو لطافت پیدا کردیتی ہے اُس کا اندازہ صرف کان اور دل کو ہم نوا بناکر ہوسکتا ہے۔ ایک جگہ ہنگامہ ہستی کا ذکر کرتے کرتے رندانہ سرمستی و خمار میں کہنے لگتے ہیں کہ "مے پرستی اسباب حُسن پرستی میں ہے۔ مستی میں ہوشیار رہنا جس سے ہوسکے رہے مجھ سے تو رہا نہیں جاتا۔"

ایک جگہ یہ ثابت کررہے ہیں کہ موت اصل میں زندگی کا دوسرا نام ہے۔ موت سے زندگی کا وجود قایم ہے ایک جاتا ہے تو دو آتے ہیں۔ یہ کہتے کہتے یکبارگی کہنے لگتے ہیں "اِس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ لو میں تناسخ کا قائل ہو گیا۔ میری غرض صرف اسی قدر ہے کہ یہاں موت میں بھی خلقت کا بازار گرم ہے" میاں بیوی کے تعلقات کے متعلق بحث کررہے ہیں۔ برابر مزاح کی چاشنی موجود ہے لیکن ادب اور مزاح کی سرحدیں اس قدر قریب ہوگئیں کہ دل وجد کرتا ہے۔ کہتے ہیں۔

"لیکن سوسائٹی نے بڑی عقل مندی کی کہ اس رشتہ کو از روئے قوانین اور رسم و رواج سب سے زیادہ مضبوط بنایا کہ دونوں مل کر یا علیحدہ علیحدہ کتنا ہی زور کریں جنبش نہ کھائے ورنہ

ڈر تھا کہ ع۔ اگر زنجیر باشد بگسلانند"

میر صاحب کی ادبی نثروں میں اُس وقت بھی ایک خاص لُطف پیدا ہو جاتا ہے جب وہ اپنی دلیل کے ثبوت میں مختلف متضاد اشیاء کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

"توانا روٹی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور ناتوانوں کو سوسائٹی پال رہی ہے
بیچاروں کو چارپائی پر پڑے پڑے دوا مل رہی ہے۔ اور تندرستوں کو محنت مزدوری کرکے بھی
پیٹ بھر کے روٹی نہیں ملتی پہلواں بوغمہ اور سوئے ہضمی سے مرتے ہیں اور فاقہ کشوں کو درد سر
بھی نہیں ہوتا، دولت مندوں کو ہر طرح کے عیش پر بھی چین نہیں اور محتاج بہشت کے دعویدار ہیں"

اِن خصوصیات کے علاوہ اُن کی ایک خوش گوار خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بیان کو کسی شعر پر ختم کرتے ہیں یہ طرزِ تحریر گو پُرانا ہے لیکن میر صاحب نے اِسے بادۂ کُہن بنا دیا۔ اُس میں سرمستیاں اور کیف زیادہ پیدا ہو گئے۔ پڑھنے والے اسی رنگ پر سر دُھننے لگے۔ اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اُن کا اشعار کا انتخاب اس قدر موزوں ہوتا ہے کہ نثر کا اچھے سے اچھا فقرہ اُس کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔ نثر اور نظم میں کوئی فرق نہیں باقی رہتا۔ مثلاً ایک جگہ ایک ہندی شاعر کے ایک دوہے کا مضمون بیان کر رہے ہیں تو کہتے ہیں:۔

"بنا گوش کی تعریف میں کسی نے موتی سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ تو اپنا گھر کھو کر زیب گوش بنا رہتا ہے
کہ دیکھنے والوں کے گھر کھوئے؟ ؎

تو وہ بھی کہتے کہ تو بے ننگ نام ہے — ایسا جو جانتا تو لٹاتا نہ گھر کو میں"

ایسی ایسی خدا جانے کتنی باتیں ہیں جو میر صاحب کے ساتھ اُٹھ گئیں اور اُردو اُن کے لئے ہمیشہ ماتم کرے گی۔ اُنہوں نے اپنی زندگی اُردو کے لئے وقف کر دی۔ قدیم اور جدید دونوں رنگوں کو اس طرح شیر و شکر کیا کہ اُردو میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا جو صرف اُنھیں کے لئے مخصوص تھا اور اب شاید کوئی اِس کمی کو پورا نہ کر سکے۔ دُنیا اُن رنگین۔ شگفتہ۔ شوخ اور عالمانہ عبارتوں کو پڑھے گی اور سر دُھنے گی۔ اُن کی جدّتِ بیان شاید مشکل سے پھر زندہ ہو سکے۔

خود میر صاحب مرحوم نے ایک جگہ فرمایا ہے۔ کہ "دردِ کُہن کا جانا بھی دل دکھاتا ہے" پھر بھلا ایسی چیز کا ماتم دل کس دل سے کرے جو ایک دیرینہ راحت تھی۔ اس رنج کی ترجمانی صرف یہی کہہ کر ہو سکتی ہے کہ ؎

مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اِک سانحہ سا ہو گیا ہے

آہ! استاذی مرحوم

(از جناب کرم الٰہی صاحب)

مکرمی تسلیم۔
خان بہادر میر ناصر علی مرحوم کی جو عنایات مجھہ پر تھیں اُسکی بنا پر میں چند سطور بطور ادائے حق "ناصر نمبر" کے لئے پیش کرتا ہوں۔ ان پریشان سطور پر مضمون کا اطلاق ہرگز نہیں ہوسکتا۔ صرف میرے صادق اور ادب آمیز خیالات کا مرقع ہیں۔ میری خوش نصیبی ہوگی۔ اگر انکو "ناصر نمبر" میں شمولیت کا اعزاز حاصل ہوا۔ خادم کرم الٰہی،

یادش بخیر! ایک وہ زمانہ تھا کہ قبلہ میر ناصر علی مرحوم ازراہِ کرم گستری میری دکان پر تشریف لاتے تھے اور گھنٹوں بیٹھے مجھے غالب کے رموز و نکات سمجھایا کرتے تھے یا آج وہ وقت ہے کہ وہ ہم میں نہیں رہے اور ہم اُن کا ماتم کررہے ہیں۔ مرحوم نے مجھے زبردستی اُردو پڑھنے پر مائل کیا تھا۔ کچھ دن محنت کرنے کے بعد میرا ارادہ اُردو پروفیشنسی کا امتحان دینے کا ہوگیا تھا۔ مگر آہ! اب کون ہے جو اس شفقت سے پیش آئے۔ اُن کے انتقال سے میرا پڑھنا بھی گیا۔ مرحوم مجھے غالب خاص طور پر پڑھاتے تھے اور کیا عرض کروں کہ مجھے اُن چند گھنٹوں میں کیسا حظ حاصل ہوتا تھا جبکہ مرحوم سے شعر و سخن پر بحث ہوا کرتی تھی۔ مرحوم کی سخن سنجی زبان زد خلائق ہے۔ اہلِ سخن آپ سے داد حاصل کرنے کی تمنا رکھتے تھے۔ نثر تو گویا آپ کے گھر کی لونڈی تھی آپ کی ساری عمر اُسی کے سنوارنے میں صرف ہوئی۔ یہ میرے بس کی بات نہیں کہ میں اُن کے کارہائے نمایاں پر کوئی مستقل تبصرہ پیش کروں۔ اور نہ اُن کے کمالات مجھ جیسے ہیچمداں کی تعریف کے محتاج ہیں۔ آپ کی خوبیاں آپ ہی کی تصنیف سے ظاہر ہیں کہ ع حسن شاہد ہے مری رنگینیٔ تحریر کا۔

مرحوم غالب کے پرستار تھے۔ میں پڑھتا اور وہ جھوم جھوم کر اُس کے مطالب بیان فرماتے۔ کبھی جوش میں آکر پوچھتے "کیا کوئی اور ایسا کہہ سکیگا؟" "میں عرض کرتا نہیں"۔ مرحوم فرماتے "دوسرا غالب آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ غالب خود کہتا ہے ؎

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں"

یکم جون کی رات کو سات بجے کے قریب مجھے طلب کیا۔ میں ملازم کے ساتھ بالاخانہ پر گیا۔ چھت پر پلنگ بچھا تھا۔ مرحوم اُس پر تشریف رکھتے تھے۔ قریب ہی مونڈھا رکھا تھا۔ میں نے آداب عرض کیا۔ آپ نے ہاتھ کے اشارے سے مونڈھے پر بیٹھنے کو کہا، میں بیٹھ گیا۔ فرمایا "دیکھو میں اس وقت دیوانِ غالب کے پہلے شعر پر

غور کر رہا تھا۔ کہتا ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اچھا، نقش تو اُس نے دُنیا کو کہا۔ ٹھیک۔ فریادی، کاغذی پیرہن سے ثابت کیا۔ لفظ "کس کی" بھی خوب کہا یعنی اِس تحریر کرنے والے کو جس نے یہ نقش بنایا آج تک کسی نے نہ دیکھا۔ "پیکرِ تصویر" میں انسان و حیوان وغیرہ سب آ گئے لیکن "شوخی"، کس چیز سے ثابت ہوئی یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ غور کرنے سے ذہن میں آیا کہ لفظ "ہر" سے یعنی ہر پیکرِ تصویر فریادی ہے۔ خوب کہا ہے یہ کمالِ شوخی کی دلیل ہے کہ اسکی شوخیٔ تحریر سے کوئی بچا نہ رہا۔ اُس نے کسی فرد کو نہ چھوڑا دُنیا میں جو چیز ہے فریاد ہی فریاد کرتی نظر آتی ہے بہت اچھا کہا ہے دیکھو "نقش فریادی" تو ہر شخص کہہ لیگا "کاغذی پیرہن" میں بھی کہہ دیتا "شوخیٔ تحریر" بھی کہہ سکتا تھا۔ "پیکر تصویر" تم کہہ دیتے مگر یہ لفظ "ہر" یعنی ہر پیکرِ تصویر کہنا غالب ہی کا حصّہ ہے۔" پھر کہا کہ "تم اس شعر کے ایک ایک لفظ کی خوبیاں لکھ کر لاؤ میں دیکھ لونگا۔ میں چاہتا ہوں کہ غالب نے جو محنت کی ہے اُسکی داد دوں۔ شرحیں تو بہت لکھی گئیں۔ ریویو بھی ہو چکے۔ میں اس کے الفاظ کی خوبیاں بیان کرنی چاہتا ہوں تمام دیوان کی نہیں صرف چند منتخب شعروں کی۔"

دوسرے روز میں نے تین صفحے لکھے اور مرحوم کو سُنائے۔ کہا خاصہ لکھ لیا، صاف کر لینا جلدی نہیں ہے، فرصت میں لکھنا تم اگر مشق کروگے تو اچھا لکھنے لگوگے ذہن اچھا ہے۔"

اس کے بعد آپ بیمار ہو گئے اور مجھے موقع نہ ملا کہ پھر کچھ لکھ کر آپکو دکھاتا۔ فلک کج رفتار نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ میں مرحوم سے کچھ حاصل کر لیتا چار ماہ ہوئے مرحوم کو حبسِ بُول کا عارضہ پہلے پہل لاحق ہوا۔ رات کے تقریباً آٹھ بجے ہونگے مجھے بُلایا معمولی سردی تھی کوٹھری میں انگیٹھی سلگ رہی تھی کدّا سچھا ہوا تھا مسہری لیٹے تھے میں قریب جاکر بیٹھ گیا میں نے السلام علیکم کہا۔ بولے کیوں مُنہ پر جھوٹ بولتے ہو۔ سلام سے کیا فائدہ ہے دیکھو مجھے تکلیف ہے پیشاب بند ہو گیا ہے اب اُمید زندگی کی نہیں ہے بوڑھے بہت ہو گئے ہیں میرے ساتھ کے سب دوست مر چکے یہ مرض بہت مہلک ہوتا ہے۔ عالمگیر اسی میں مرا شاہجہاں اِسی مرض میں دُنیا سے رخصت ہوا۔ اور بڑے بڑے فلاسفر اور دماغی کام کرنے والے اسی بیماری کا شکار ہوتے ہیں"

میں نے عرض کی آپ اتنے کیوں گھبراتے ہیں یہ مرض آپکو آج کا تو ہے نہیں پُرانا ہے۔ فرمایا "ہاں ہے تو بہت پُرانا۔ لیکن دماغ درست ہے اس میں خرابی نہیں ہوئی اسی سے اُمید بچنے کی معلوم ہوتی ہے۔" میں نے کہا بس آپ اطمینان رکھیں آرام ہو جائیگا۔ اور دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے چلا آیا دو تین دن میں آرام ہو گیا۔ مرحوم میرے پاس پھر آنے جانے لگے اور فیض رسانی کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا لیکن آہ! کسے معلوم تھا کہ چل چلاؤ کا وقت آن پہونچا ہے!

دوسرا حملہ زیادہ زبردست ہوا تھا۔ دن کے دس یا گیارہ بجے ہونگے کہ ملازم آیا کہا میر صاحب کی آج طبیعت بہت خراب ہے تم کو بلاتے ہیں۔ میں گیا مرحوم کمرے میں اکیلے لیٹے تھے، گھبراہٹ ہو رہی تھی، فرمایا تم آگئے اور رونے لگے پھر کہا "دیکھو تم کو اس واسطے بلایا ہے کہ تم کو گواہ کرلوں۔ میں تمہارے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ خدا ایک ہے، بڑا شریف اور نیک ہے۔ اس کا رسول برحق ہے۔ تو گواہ رہیگا؟ میں نے عرض کی "ہاں میں گواہ ہوں" بس ایک دم چارپائی سے اٹھ بیٹھے اور رو کر کہنے لگے کہ دیکھو میں نے بہت علم حاصل کیا خدا کی بہت تحقیق کی، لیکن میرے کچھ کام نہ آیا دنیا سے اسی طرح جا رہا ہوں جیسے آیا تھا" مجھے فوراً آپکے والد ماجد کا قول یاد آگیا جو مرحوم کی زبانی سنا تھا ؎

اس چمن سے گل تابت پیرہن لے جائینگے کیا یہاں سے آکے مرغان چمن لے جائینگے

کچھ توقف کے بعد فرمایا "دیکھو میری بصارت بھی کام نہیں دے رہی مجھے تمہارے خط و خال نہیں نظر آرہے" میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "تم ابھی نہ جانا جب تک میرا دم نہ نکل جائے دیکھ کر جانا کہ اسی برس کے بعد کس طرح انسان کا دم نکلتا ہے"

اتنے میں انصار صاحب ڈاکٹر کو لے کر آگئے اور کہا "آپ نہ گھبرائیں ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں آپ ابھی اچھے ہوجائینگے" فرمایا "اچھا ڈاکٹر صاحب کیا آپ آگئے" ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ گھبرائیں نہیں ابھی آرام ہوجاتا ہے" فرمایا "دیکھئے اس وقت مجھے تکلیف نہ دیجئے اگر آپ نے اس وقت سلائی لگائی تو یہ ہوگا کہ ادھر آپ سلائی لگائینگے ادھر میرا دم نکل جائیگا۔ میرے جلانے سے تم لوگوں کو کیا فائدہ ہو رہا ہے" ڈاکٹر نے کہا تکلیف تو میں آپ کی ابھی کھوئے دیتا ہوں، اس کو تو رہنے نہیں دینے کا۔ اور موت زندگی خدا کے ہاتھ ہے ڈاکٹر نے سلائی لگائی بڑی تکلیف ہوئی چلائے لیکن پیشاب سب خارج ہوگیا۔ ذرا آرام معلوم ہوا حلق خشک ہوگیا، نارنگی چھیل چھیل کر میں مرحوم کے منہ میں دیتا رہا پھر مثانہ کو دھویا گیا اس سے بھی سخت تکلیف ہوتی رہی یہ سب عمل ختم ہونے کے بعد بالکل چین پڑ گیا اور آنکھیں کھل گئیں دس منٹ کے بعد آپ نے میری طرف دیکھا کہا "تم بیٹھے ہو" مسکراتے ہوئے بھی ان سب نے جلا لیا۔ اچھا اب تم جاؤ نہیں دیر ہوتی ہے ہرج ہوگا" ہاتھ ملایا میں آداب عرض کہہ کر چلا آیا پھر ایسا رہا کہ روزانہ سلائی کے ذریعہ پیشاب نکالا جاتا اور ایک مرتبہ مثانہ کو روز دوائی کے ساتھ دھویا جاتا۔

اب یہ تیسرا موقعہ تھا کہ ۵ جون کو شام کے قریب ۶½ بجے ملازم بلانے آیا۔ میں گیا، آداب عرض کی بیٹھ گیا۔ فرمایا "دیکھو آج ہم سب لڑکیوں وغیرہ سے رخصت ہولئے ہیں صرف ایک تم رہ گئے تھے سو تم سے بھی رخصت ہولیں اس لئے تم کو بلایا ہے" میں نے عرض کیا ایسا نہ کہیئے کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے۔ پیشاب رک گیا ہوگا اس کی تکلیف ہوگی ڈاکٹر کو بلائیے وہ پیشاب نکال جائیگا آرام ہوجائیگا فرمایا "نہیں نہیں یہ بات نہیں پیشاب تو کئی روز سے خود بخود آرہا ہے اور بڑے زور کے ساتھ آتا ہے" پاخانہ

چھ روز سے نہیں ہوا تھا سخت تکلیف تھی میں نے آج کمرے سے لڑکیوں کو ہٹا دیا اور دروازے بند کر کے سجدہ میں گرا اور خدا سے گڑ گڑا کر بہت عاجزی سے دعا مانگی۔ کہ اے خدا میرے جلانے سے یا جینے سے تجھے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مجھ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ بس اب تو اسے ختم کر دے' یہ انصاف نہیں ہو رہا۔ میں بُوڑھا ہوں کمزور ہوں مجھے اتنی تکلیف کیوں دی جا رہی ہے' میں نے یہ ذکر کسی سے نہیں کیا تم سے کہتا ہوں۔ خیر اس کے بعد اتنا ضرور ہوا کہ مجھے دو تین دست ہو گئے۔ اور تکلیف جاتی رہی" میں نے کہا۔ شکر ہے ہنس کر فرمایا "شکر کے لائق تو نہیں ہے ہاں البتہ تکلیف نہیں رہی۔ لیکن اب یہ معاملہ طے ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ دیکھو خدا کا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے اچھے خاندان میں پیدا کیا۔ علم دیا۔ دولت دی۔ بیوی نیک عطا کی۔ اولاد بھی دی۔ یہ سب کچھ ہوا سرکار میں عزت بھی ہوئی خطاب بھی پایا' لیکن اب بُوڑھاپے میں انصاف نہیں ہو رہا کیا انصاف ہوگا؟" میں نے عرض کی انصاف خدا ضرور کرتا ہے اور ضرور انصاف ہوگا۔ مرحوم نے فرمایا کیا انصاف ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیونکر ہوگا۔ خیر اب تو یہ جھگڑا ختم ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔"

پھر فرمایا "اچھا کیا تو میرے ساتھ کھانا کھائیگا؟" میں نے عرض کی کہ کھانا تو میں کھا کر آیا ہوں اگر آپ کا حکم ہو تو ضرور کھا لونگا۔ مرحوم نے مسکراتے ہوئے فرمایا "نہیں مطلب یہ ہے کہ کھانا کھلا کر تجھ پر احسان کروں" میں نے کہا تو میں زیادہ خوشی سے کھانے کو تیار ہوں۔ لڑکے کو آواز دی کھانا لاؤ۔ کھانا آیا دو تین چھوٹے چھوٹے لقمے لئے اور ہاتھ کھینچ لیا۔ فرمایا اب کھانا بھی نہیں کھایا جاتا۔ پھر دو چار ادھر اُدھر کی باتیں کیں ہنستے رہے خوش ہو کر مجھے رخصت کیا۔

دوسرے روز صبح کو انصار صاحب فرخ نگر سے مرحوم کو دیکھنے آئے مجھے بلُایا لڑکے نے کہا قلم دوات اور کاغذ لیتے آنا۔ میں قلم دوات کاغذ ساتھ لے کر گیا۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور آہستہ سے فرمایا انصار علی نے میرے دیکھنے کے لئے انصار کو بھیجا ہے' میں نے خط کا جواب لکھنے کے لئے تمہیں بلُایا ہے خط لکھوایا اتنے میں انصار صاحب آ گئے اُن کے ہاتھ میں رسالہ ساقی تھا وہ چارپائی کے قریب کھڑے ہو گئے آپ مجھ سے باتوں میں مشغول تھے' میں نے کہا کہ انصار صاحب آ گئے ہیں رسالہ ساقی لائے ہیں اس میں شاید آپکا کوئی مضمون ہو۔ آواز دی "انصار تم آ گئے ساقی لائے ہو اچھا تو میرا مضمون سُناؤ کیا ہے؟"

انصار صاحب نے پڑھنا شروع کیا سُنتے رہے اور تعریف کرتے رہے کہ "بھئی لکھا خوب ہے میں حیران ہوتا ہوں جب اپنے مضمونوں کو سُنتا ہوں کہ میں کیسے لکھ گیا!" جب مضمون سُن چکے فرمایا "مجھے معلومات خوب تھی' تمہارے آج کل کے مولویوں سے زیادہ معلومات تھی' میں نے بھی تائید کی' انصار صاحب سے کہا شاباش میں اس وقت بہت خوش ہوا' اب تم جاؤ چائے پی لو پھر تم کو جانا ہے گاڑی کا وقت قریب ہے اور انہوں نے مجھ سے کہا خط ان کو دے دو۔ انصار صاحب نیچے مکان میں چلے گئے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا "تمہیں جس وقت فرصت ہو تو دیوانِ غالب لیتے آنا" میں نے کہا میں خالی بیٹھا رہتا ہوں فرصت ہی ہے'

کہنے لگے "میرا مطلب یہ ہے کہ تمہارا ہرج نہ ہو" میں نے عرض کی نہیں میرا کوئی ہرج نہیں ہے۔ مرحوم نے مسکراکر کہا "اچھا لے آؤ بیٹا مجھے شرم آتی ہے تمہارا نقصان نہ ہوتا ہو"۔ میں دوکان سے دیوان غالب لے کر پہونچا مرحوم نے فرمایا۔ "اچھا وہ چکنی ڈلی والی غزل نکالو" میں نے غزل چکنی ڈلی والی پڑھی ایک ایک شعر کی تعریف فرماتے رہے پھر کہا۔ اب وہ غزل پڑھو ع "کئے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیئے" میں نے وہ غزل بھی سنائی آپ اسکی خوبیاں بیان فرماتے گئے۔ جب یہ شعر میں نے پڑھا ؎

کہیں حقیقتِ جانکاہیٔ مرض لکھیئے　　کہیں مصیبتِ ناسازیٔ دوا کہیئے

فرمایا یہ شعر انتصار علی کے خط میں نیچے لکھ دو"۔ اور مجھے رخصت دی۔ ہاتھ ملایا (Thank you) کہا۔ بس اس کے بعد قیامت تک کے لئے مجھ سے رخصت ہوگئے"۔ یہ میری اور مرحوم کی آخری ملاقات تھی۔ خدا وند مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

ارادت کیش۔ کرم الٰہی

"ساقی اور صلائے عام"

ساقی کے اجراء سے خان بہادر میر ناصر علی مرحوم کو جو مسرت ہوئی اور جس شد و مد کے ساتھ مرحوم نے اس کا خیر مقدم کیا وہ ہر طرح ساقی کے لئے باعثِ فخر و مباہات ہے۔ ایسے جلیل القدر نقاد اور سخن فہم کی زبان و قلم سے نکلے ہوئے چند کلمات ساقی کی عین خوش نصیبی کا باعث ہیں۔ ذیل میں اُن تبصروں کے اقتباسات بصد فخر درج کئے جاتے ہیں جو وقتاً فوقتاً "صلائے عام" میں شائع ہوئے ع ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ ایم:۔

"ساقی"

اِس نام کا رسالہ کئی مہینہ سے دلّی سے نکل رہا ہے۔ اخباری رسوخ کے موافق مجھے "صلائے عام" میں اس کا ذکر کرنا پہلے چاہیئے تھا۔ مگر میرا قاعدہ ہے کہ دو چار پرچے نکلنے کے بعد لکھنے کی مجھے ہمّت ہوتی ہے، سبب یہ کہ اکثر رسالے عمرِ طبیعی کو نہیں پہونچتے۔ اخبار نویسی میں کسی پہونچے ہوئے فقیر کی دعا ہے کہ اُردو کے رسالوں کو بڑی عمر نصیب نہیں ہوتی۔

رسالہ کا نام ساقی شاعرانہ ہے کہ اہلِ سخن میں ساقی سے مفر نہیں۔ خاصکر حضرت حافظؒ کی سُنّت ہے کہ شراب کے مضمون ان سے بہتر لکھنا مشکل ہے اور شراب کے لئے ساقی کی ضرورت ہے۔ جس طرح تصوف میں حافظ کی شراب سے بادۂ عرفان مقصود ہے اِسی طرح شاعرانہ اصطلاح میں ساقی سے غرض حمدِ ایزدی سمجھیئے۔

قدیم یونان کی لٹریچر میں اپالو کے نام سے آغازِ سخن کا دستور تھا اور اپالو تمام دیوتاؤں کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ فارسی والوں نے جن کو یونان کی تہذیب سے واسطہ رہا حمدِ الٰہی میں ساقی کو پُکارنا پسند کیا۔ حمد کی طرح یہ آغازِ کلام ہو گیا۔

اِس میں شک نہیں کہ جس طرح یونانی لٹریچر میں شعر و شاعری کی دیبیاں مشہور تھیں جن کو پُکار کر کلام کی تمہید ہوتی تھی اِسی طرح ایشیا میں ہر کلام کا آغاز خدا کے نام سے رائج ہے۔ شعراء نے تو اپنا کلام اکثر ساقی ہی سے شروع کیا۔ یہ بُرا نہیں کیا کہ آغاز کلام عیش سے شروع ہو تو زیادہ مناسب ہے۔ اس تمہید سے میری غرض یہ ہے کہ ہر کلام کا آغاز اسبابِ عیش و مسرّت سے شروع ہو تو زیادہ دل کش معلوم ہوتا ہے اور دل لگا کر سُننے کو جی چاہتا ہے ؎

ساقی قدح شراب دیدے
مہتاب میں آفتاب دیدے

ساقی کی رعایت سے فارسی میں لاجواب ساقی نامے لکھے گئے۔ ظہوری کا ساقی نامہ شاعری کی جان ہے۔

بڑے حجم کی ایک علیحدہ کتاب ہوگئی اور کمال ہے کہ شروع سے یعنی حمد سے آخیر تک اسی رعایت میں ساری کتاب ختم کردی۔ بسم اللہ اس شعر سے ہے ؎

ثنا ہا ہمہ ایزدِ پاک را ثریا دہ طارمِ تاک را

شراب کی ضد میں۔ جو حرام ہے۔ "ایزدِ پاک" خوب کہا۔ اور ثریا کی تشبیہہ جو انگور کے خوشے سے مشابہ ہے بے مثل ہے۔ اسی طرح ساری کتاب میں کمالِ شاعری دکھا دیا ہے۔

ایک دفعہ مجھے فارسی کے ساقی ناموں کے جمع کرنے کا خیال ہوا تو سَو سوا سو سے زیادہ ہاتھ لگے اردو میں بھی اکثر کلام ساقی سے شروع کیا جاتا ہے۔ اصغر علی خاں نسیم نے الف لیلہ نظم میں لکھی تو ہر رات ساقی و شراب کے مضمون سے شروع کی اور ہر رات میں اس رعایت سے علیحدہ علیحدہ مضمون باندھا۔

حضرت اسماعیل مُنیر نے معراج المضامین نامے مثنوی میں حضرت خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا کی مدح پاک میں بے مثل ساقی نامہ لکھا ؎

گلابی ہو مرے تقوے کا جامہ ردائے دُخترِ رز ہے عمامہ

اتفاق سے رسالہ ساقی کے نکالنے والوں میں جوان خیال اور جوان طبیعت اہلِ قلم نظر آتے ہیں۔ یہ مناسبت خداداد ہے۔ برخلاف اس کے راقم الحروف نہایت ضعیف العمر ہے۔ اس نقص کی وجہ سے ریویو نگاری کا حق ادا کرنے میں جس طرح کہ ادا کرنے کو جی چاہتا ہے یا جس طرح ادا کرنا چاہیئے ادا نہیں کر سکتا لیکن سب سے اچھا طریقہ ریویو کا میرے ذہن میں یہ ہے کہ ہر پرچہ کی خوبیاں علیحدہ علیحدہ بیان کرنے کے عوض ماہ جون کے ساقی کا ایک مضمون بجنسہٖ "صلائے عام" میں نقل کئے دیتا ہوں کہ اسی پر اور مضامین کا مرتبہ قیاس کر لیا جائے۔

اس مضمون کے نقل کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دلی کی معلومات اور قلعہ معلی کی زبان بلکہ روزمرّہ کی زندگی کا اچھا مُرقّع ہے۔

صاحبِ مضمون کی مورّخانہ معلومات کا میں بہت مدّاح ہوں کہ آپ کا مضمون غدر سے پہلے کی تاریخ کا بڑا دلچسپ حصّہ ہے۔ گو مختصر سہی۔

(اس کے بعد "لال قلعہ کی ایک جھلک" مصنفہ سیّد ناصر نذیر فراق مرحوم نقل کیا گیا)

ساقی کے پہلے "دلّی نمبر" کو خان بہادر میر ناصر علی مرحوم کے نامِ نامی سے منسوب ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ اُسکے متعلق مرحوم نے "صلائے عام" بابت ماہ نومبر ۱۹۳۱ء میں یہ نوٹ مرقوم فرمایا۔

.... رسالہ ساقی (دہلی) کا احسان ہے کہ اس کے "دلّی نمبر" نے مجھے زندہ کر دیا۔ زلیخا کی دوبارہ جوانی کی طرح مجھ میں پھر جان آگئی ؎

نمیرد آنکہ داد بندگی داد   خدا اورا دوبارہ زندگی داد

ایک اور مقام پر چار چاند مصنفہ حضرت فراق مرحوم پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

دلی کی عید!

حُسنِ اتفاق سے مجھے عید کی نماز سالہاسال سے دلی کی عیدگاہ میں پڑھنی نصیب ہوجاتی ہے۔گو عید کی نماز دلی کی اور مسجدوں میں بھی ہوتی ہے لیکن میں باوجود نہایت ضعف کے گرتا پڑتا عیدگاہ ہی پہونچتا ہوں:-
دلی کی عیدوں کا حال حضرت فراق دہلوی جس خوبی سے لکھتے ہیں مجھ سے کیا اور کسی سے بھی اس طرح لکھنا ناممکن ہے۔جناب شاہد احمد دہلوی نے جو رسالہ ساقی نکالتے ہیں مجھے حضرت فراق کے چار مضمونوں کا مجموعہ چار چاند نامے "بغرضِ اظہارِ خیال" بھیجا۔"اظہارِ خیال" سے غرض اگر ریویو ہے تو یہ طرز ریویو لکھوانے کا بُرا نہیں اور لفظِ ریویو کا نہایت شائستہ و شریفانہ ترجمہ ہے۔مجھے ریویو لکھنا نہیں آتا۔ریویو کی عوض مجھے یہ پسند ہے کہ اس تصنیف کی کچھ عبارت نقل کردی جائے کہ پڑھنے والے آپ اپنی رائے لگالیں۔
چار چاند میں دلی کی قدیم وجدید عیدوں کے ذکر میں شاہجہاں بادشاہ کے زمانہ کی عید کا حال بہت خوب لکھا ہے۔
(اس کے بعد حضرت فراق مرحوم کے مضمون کا اقتباس درج کیا گیا)

ساقی کے ابتدائی نمبروں میں "جام نوازیوں" کے تحت میر صاحب مرحوم کے چند لطیف فقرے درج کئے گئے تھے۔اُسکے متعلق مرحوم نے فرمایا:-
"......میں جناب شاہد احمد صاحب مدیر رسالہ ساقی کا احسان مند ہوں کہ آپ نے "صلائے عام" سے چند اقتباس "جام نوازیوں" کے عنوان سے ساقی میں درج فرمائے۔مجھے اقتباس کا یہ طرز اس لئے پسند آیا کہ عرصہ سے تقاضہ ہے کہ "صلائے عام" کے مضامین کتاب کی صورت میں شائع ہوجائیں۔اپنی زیادہ ضعیفی کی وجہ سے مجھے "صلائے عام" کے مضمون منتخب کرنے کی ہمت نہیں۔اگر کوئی صاحب انتخاب کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں تو میں تقاضے سے بچ جاؤں اور "صلائے عام" کے قدرشناس خوش ہوں"

ایک مرتبہ ساقی میں مرحوم کے چند مضامین پریشاں کے اقتباسات شائع ہوئے۔مرحوم نے ازراہ قدردانی "صلائے عام" بابتہ اکتوبر ۳۱ء میں یہ نوٹ درج فرمایا:-
"......یہ مضمون دراصل "صلائے عام" کے چند مضمونِ پریشاں کا انتخاب ہے۔جو صاحب رسالہ ساقی کو

از روئے قدرشناسی و سخن فہمی پسند آتے۔ بقول لسان الملک حضرت ریاض ؎

ہم نے اپنے آشیاں کیواسطے — جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے"

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں :-

"......... یہ مضمون رسالہ ساقی دہلی سے نقل کیا گیا ہے مضمون کے طرزِ بیان سے ظاہر ہے کہ "صلائے عام" کا مضمون ہے۔ صاحب رسالہ ساقی خود اچھے مضمون لکھتے ہیں اور "صلائے عام" کے اچھے مضامین کا طرز پسند کرتے ہیں ؎

تھا طرحدار آپ بھی لیکن — رہ نہ سکتا تھا یہ بھی صورت بن"

اس قسم کا آخری نوٹ جو "صلائے عام" میں درج ہوا یہ ہے :-

"......... میں چاہتا ہوں کہ اس طرز کے مضمون "صلائے عام" سے زیادہ لکھے جائیں کہ زیادہ عمر ہوجانیکی وجہ سے میں خود تو لکھنے پڑھنے کے کام کا نہیں رہا مگر اس طرح کے چند اقتباس کبھی کبھی دیکھنے میں آجائیں تو برا نہیں بقول حضرت نوح ؎

ساقی بزم مجھے دیکھ کے آنکھیں نہ چرا — انہیں پیمانوں سے دیدے انہیں پیمانوں میں

اور بقول جناب عزیز ناطقی ؎

ختم ہی سمجھو زندگی کے دن — کچھ ورق اور ہیں فسانے کے"

ساقی کو زیادہ رنج اس بات کا ہے کہ مرحوم جیسا قدردان پیدا ہونا مشکل ہے۔ افسوس!

ع "اب کہاں لوگ اس طبیعت کے"

"ماتمِ ناصر"

میر صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد میرے والد کے نام، عمِ بزرگوار کے نام اور میرے نام بے شمار تعزیتی خطوط آئے جن میں سے صرف وہ چند شائع کئے جاتے ہیں جو ایک حد تک باعثِ تسلی ہوئے اور جو اپنے دلکش لٹریچر کے اعتبار سے بھی اس لائق ہیں کہ خوش مذاق قارئینِ ساقی کی نگاہ سے گذریں۔ آخر میں چند موقر رسالوں کے ماتمی نوٹ بھی درج کئے جاتے ہیں ؎

ہم نے اپنے آشیاں کیواسطے ۔۔۔ جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

××××× خان بہادر سید ناصر علی خاں کی موت نے دُنیائے ادب کو با شکستہ بلکہ زندہ درگور کر دیا۔ مثال میں اُن کا مثل نہ تھا۔ نازک خیالی اُن کا حصّہ تھی۔ اُن کے معاصرین میں اچھے اچھے انشا پرداز اُن کی تقلید سے عاجز تھے۔ مہدی حسن اقتصادی اُن کے نقطے نقطے کو ہمیشہ اپنے لئے مشعل راہ سمجھے۔ اُنھوں نے تقلیداً گو بہت امتیاز پیدا کیا اور ایک خاص طور پر وہ اپنے طرز کے موجد بھی تسلیم کئے گئے۔ مگر بلندیٔ خیال اور ندرتِ مثال کے ساتھ خان بہادر کے لئے زبان کی پاکیزگی زبان کی شستگی و بیساختگی اوّل سے آخر تک ان تمام خصوصیات کی مالک رہی جو اُن کی طبعی ذہانت اور اُن کی بلند نظری نے قدرت سے حاصل کر لی تھی۔ سر سید نے اُن کو ہمیشہ "ناصح مشفق" لکھا۔ تہذیب الاخلاق میں اچھے اچھے لکھنے والوں نے اُن کا لوہا مانا۔ آگرہ اخبار۔ تیرھویں صدی اور صلائے عام کے پچھلے مضامین ہمیشہ ان کو زندۂ جاوید رکھنے والے ہیں۔ مجھے یہ رونا ہے کہ میرا قدر شناس اس مرتبے کا اب کوئی نہیں رہا۔ میں انصار ناصری اور ان کے خاندان کی ہمدردی نہیں کر سکتا، وہ میری ہمدردی کریں۔ مجھ میں جان ہی نہیں کہ میں اس صدمے کو اپنے لئے جاں گُسل کہوں۔ میں یہ صدمہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر مولوی سبحان اللہ خانصاحب رئیس گورکھپور اور ان کے مثل بعض اور علمدوست حضرات کو برداشت کرنا ہی ہو گا ؎

تاب لاتے ہی بنیگی غالبؔ ۔۔۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

راقم
ریاضِ افسردہ۔ خیرآباد

××××× کارڈ ملا۔ مجھے اس سے قبل ہی حادثہ کی اطلاع مل چکی تھی۔ مرحوم نے زبان کی جو جلیل القدر خدمات انجام دی ہیں ان سے ہر اہلِ قلم واقف ہے اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ اب اس خالی جگہ کو پُر کرنے والا کوئی نہیں ہے مرحوم اپنے رنگِ انشا میں فرد و فرید تھے اور افسوس کہ یہ رنگ انہیں کے ساتھ گیا۔ اُن کے مضامین کا مجموعہ شائع

ہونا ازبس ضروری ہے۔ خدا کرے آپ جلد اس طرف توجّہ کر سکیں۔

نیاز فتحپوری

میر ناصر علی خاں

×××× افسوس مجلسِ ادب کی کیسی روشن شمع ایکدم گُل ہوگئی۔ موت العالم موت العالم۔ اُن کا مرنا اُردو انشا پردازی کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ مرحوم رنگِ پریشان کے خود ہی موجد اور خود ہی منتہی تھے۔ میں ان کی تاریخ وفات لکھنا چاہتا تھا کہ میر صاحب کی روحانیت نے فرمایا کہ میرے نام ہی سے تاریخ وفات ظاہر ہے۔ (۱۳۵۲ھ) فی الحقیقت اس سے بہتر تاریخ اور کیا نکال سکتا ہوں۔ تعزیت کو مضمون نہیں ملتا کیا لکھوں اور کس کو لکھوں کل اہلِ قلم انکی مفارقتِ دائمی سے اندوہگیں ہیں اور جب تک اُن کی جگہ خالی رہیگی۔ لکھنے والے اُن کا مرثیہ لکھتے رہیں گے۔

آپ کا ہمدرد

جمشید علیخاں۔ اختر

××××× خان بہادر میر ناصر علی کی وفات حقیقت میں دُنیائے ادب کا ایک سانحہ عظیم ہے مجھے اس المناک اطلاع سے بے حد صدمہ ہوا، یہ دور بہت نازک دور ہے تھوڑے عرصہ میں کئی اُردو کے زبردست ادیب دُنیا سے اُٹھ گئے، خدا اپنا فضل کرے۔ مرحوم کا مجموعۂ مضامین ضرور شائع ہونا چاہیئے۔ اور صلائے عام کو بطور یادگار جاری رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

نیازمند

سیماب اکبرآبادی

××××× آپ کے ۱۳ر جون کے خط نے ایک روح فرسا خبر پہونچا کر مجھکو چند لمحے کے واسطے تصویر رنج و غم بنا دیا۔ خاص کر مجھ پر خان بہادر مرحوم کے ایک عرصہ سے بزرگانہ الطاف تھے۔ ان کا اظہار زبان قلم کے لئے ناممکن ہے۔ اب زبان اُردو مجسمۂ بے سر رہ گئی ع کہاں سے لائیگا بلبل دہن اُنکا زباں اُنکی۔

خاکسار

عبدالرشید خاں تحصیلدار پاٹودی

××××× آپ کا کارڈ ملا، پڑھکر جو روحی صدمہ مجھے ہوا بیان نہیں کر سکتا۔ میں اس حادثۂ جانکاہ کے لئے ابھی تیار نہ تھا۔ میر ناصر علی صاحب کی موت دراصل اُردو کی موت ہے۔ آہ! میں جس طرز انشاء کا دلدادہ ہوں وہ اب ختم

سمجھئے۔ ۵ سودائے زلفِ یار کا اب سلسلہ ہی کم آباد تھا یہ کوچہ دلِ ناتواں تلک

میر صاحب کو جو محبت و شیفتگی مجھ سے تھی اُسے دیکھتے ہوئے یہ المناک واقعہ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ سچ یہ ہے کہ میر صاحب کی موت اپنی نوعیت کے لحاظ سے کسی طرح لائق صبر نہیں، پھر کیوں کر کہوں کہ صبر کرو، دل پر جبر کرو۔

دلی کی ایک روحی صحبت میں میر ناصر علی کی یہ پاکیزہ اور دلکش آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے کہ:۔ "دلگیر کی نظر سے دُنیا کا کوئی حسن نہیں بچ سکتا" روحی فداک، ایسے قدردان کہاں سے لاؤں؟ زمانہ ہزاروں گردشوں کے بعد بھی ایسا لطیف اُردو لکھنے والا پیدا نہیں کر سکتا۔ مرحوم تہدی سے پوچھئے! اگر دل ٹھکانے رہا تو میر صاحب کی وفات حسرتِ آیات پر چند سطریں لکھکر میں بھی ساقی کے لئے روانہ کرونگا۔ مضامینِ ناصر کا عمدہ انتخاب ضرور اور جلد شائع کیجئے، میری ناچیز خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔

آپکا مخلص

شاہ دلگیر ناصری

××××× جس حادثۂ جانکاہ کی آپنے خاکسار کو اطلاع دی اُس کا مجھے اتفاقاً پہلے سے علم ہو گیا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون حضرت میر ناصر علی خان بہادر مرحوم آپکے دادا تھے لیکن زبانِ اُردو اور ادب کو اگر دلہن سمجھ لیا جائے تو مرحوم کو اسکی مشاطۂ کامل فن کہوں تو بجا اور نوشاہ کہوں تو درست ہوگا۔ افسوس مرحوم کے اُٹھ جانے سے زبانِ اُردو بیوہ ہو گئی اور اسکے حسن و جمال کا آفتاب گہنا گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے سایۂ فضل و عفو میں جگہ دے۔ آمین! خدا کرے آپ مقاماتِ ناصری کی طرف جلد متوجہ ہو سکیں۔

خاکسار

مہر محمد خاں شہاب

××××× آپ کی تحریر سے خبر جانگزا یعنی خبر وفات محترمی خان بہادر میر ناصر علی سُن کر جو صدمہ ہوا ناقابلِ تحریر ہے، دہلی مدت سے مرحوم کہے جانیکی مستحق ہو چکی ہے لیکن اس حادثہ سے فی الحقیقت اس فخر البلاد کی حالت قابلِ رحم ہو گئی، ادب اردو اور ایسا ادبِ اُردو جو پرانی و نئی تحقیقات و معلومات کا حامی و حامل تھا وہ تنہا ذاتِ مرحوم تک تھا۔ اب ایسی کلاسیکل اور مسلم الثبوت ادبی حیثیت کسی میں نظر نہیں آتی۔ آج اردو بیوہ ہو گئی۔ آج اُردو یتیم ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مجھے اپنے غم کا شریک سمجھئے اور جو خدمت میرے لائق ہو لکھئے۔

دُعاگوئے انام

احسنِ بدنام (از مارہرہ)

××××× آپکے جدِّ امجد مرحوم کی وفات کی اطلاع ملی، اُردو کا ایک ماہر ادیب اور کامل انشا پرداز اُٹھ گیا۔

وہ ہماری پرانی مجلس کی شمع انجمن افروز تھے۔ اللہ تعالےٰ مغفرت فرمائے۔ میری طرف سے تعزیت دلی قبول فرمایئے۔

سید سلیمان ندوی



Extract from the Honourable Sir John Thompson. Esquire, K. C, I. E., C. S. I., I. C. P., etc. dated London, the 10th July 1933.

It was with the deepest regret that I heard of the death of my dear old friend Khan Bahadar Mir Nasir Ali. I had known him for more than 30 years during which time we had corresponded regularly when we were not both living in Delhi. I always enjoyed getting his letters and still more my talks with him. We had a great deal in common in our historical tastes, and he had a wonderful fund of knowledge and reminiscence about old Delhi days. I fear there is no one like him now left, and I never came across with any one who had such Zest in the pursuit of information, specialy in regard to things that had been forgotten. It is a very sad thought to me that I shall never hear from him again, but I have with me all the articles he wrote for the Sala-i-Am on historical subjects and also on old Delhi society and customs and the style of them is so reminiscent of him that they will bring him back to me very vividly.

Please convey my deep sympthy to all the surviving members of his faimily. He seemed so vigorous and wrote so happily that I was in great hope that he would be spared for many years to come.



نگار:- "یہ سال ارباب ادب و انشاء کے لئے بہت خون آشام ثابت ہوا۔ مرزا رسوا کی موت، طبا طبائی کا انتقال ناصر نذیر فراق کی رحلت اور پھر آخیر میں میر ناصر علی کا اُٹھ جانا، ایسے معمولی واقعات نہیں جنہیں دُنیائے علم و ادب فراموش کر سکے۔ یہ سب بزم اُردو کے اُس دور کی یادگار تھے جس کو دُنیا بھلا چکی ہے اور جو متقدمین و متاخرین کے درمیان "عقدۃ الوسطیٰ" کی حیثیت رکھتے تھے۔

مرزا رسوا پر لکھنؤ کی زباندانی ختم ہو گئی اور فراق پر دہلی کی، طبا طبائی کے ساتھ لکھنؤ کے عہد آخریں کا فضل و کمال ختم ہو گیا اور ناصر علی ادب و انشاء کے اُس رنگ کو اپنے ساتھ لے گئے جو ان کی زندگی میں بھی کسی دوسرے کا حصّہ نہ ہو سکا، اب مرنے کے بعد کیا ہو گا۔

میر ناصر علی کی ساری زندگی اُردو زبان کی خدمت میں گذری اور ہر چند وہ خادمت "صلائے عام" کے اجراسے آگے نہ بڑھ سکی۔ لیکن جنہوں نے "صلائے عام" کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کی جلدوں میں کیسے کیسے جواہر ادب پوشیدہ ہیں اور وہ کونسی خدمت زبان تھی جو اس رسالہ کے ذریعہ سے میر ناصر علی نے تقریباً ایک ثلث صدی تک انجام نہیں دی۔

وہ ان کا سہل ممتنع انداز تحریر، وہ ہلکے ہلکے مزاحیہ فقروں کے ساتھ مابعد الطبیعات کے خشک و بے آب رنگ نظریوں کو ہمارے لئے گوارا بنا دینا۔ میر ناصر علی کی وہ خصوصیت تھی جس سے ان کی تحریر کا کوئی فقرہ خالی نہ ہوتا تھا۔ پنشن لینے سے قبل بھی ان کا محبوب مشغلہ کتابوں کے مطالعہ کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن پنشن کے بعد تو اُن کی زندگی کا کوئی لمحہ لکھنے پڑھنے کے علاوہ کسی اور شغل میں بسر ہی نہیں ہوا ۔۔۔ جب دیکھئے وہ ہیں اور خاک آلودہ کتابوں کا ڈھیر، کتابوں کا ڈھیر ہے اور اُن کی جھکی ہوئی گردن۔ پڑھ نہیں رہے ہیں تو لکھ رہے ہیں، اور لکھتے لکھتے تھک گئے تو پھر پڑھنے میں مصروف ہیں۔ الغرض اُن کی زندگی ایسی قابلِ رشک زندگی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے اور جس پر حقیقتاً ایک انسان کو فخر کرنا چاہیئے۔

مجھے معلوم ہے کہ جناب انتصار ناصری (بی۔ اے) مرحوم کے پوتے اُن کے مضامین کا مجموعہ شائع کرنا چاہتے ہیں، خدا کرے یہ صحیح ہو کیونکہ اس طرح مرحوم کے ادبی خدمات سے ملک کو مستفید ہونے کا موقع حاصل ہو جائے گا۔ لیکن میں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ انتخاب مضامین کا کام کسی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے اور تنہا ایک شخص اس اہم ذمہ داری کو اپنے سر نہ لے۔"



شاعر

میر ناصر علی خاں:- دُنیائے ادب میں یہ خبر کمال حزن و ملال کے ساتھ سُنی جائیگی کہ دہلی کے ادیب شہیر میر ناصر علی خان بہادر مدیر "صلائے عام" ۱۲ رجون کو پیر کے دن ۲ بجے دوپہر کو انتقال فرما گئے۔ مولانا نظم طبا طبائی لکھنوی۔ مولوی محبوب عالم، حضرت ناصر نذیر فراق اور مولانا ستاد دہلوی کے بعد

ایک عرصہ مختصر میں یہ پانچواں واقعہ ہے کہ اُردو کا ایک مستند اور باکمال ادیب اس قحط الرجال کے زمانہ میں ہم سے چھین لیا گیا۔ مرحوم کی عمر ۸۶ سال تھی۔ چار ماہ سے حبسِ بول کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ "صلائے عام" کے ذریعے ۴۰ سال تک میر صاحب نے ادبِ اُردو کے احیاء و استحکام کی جو کوشش فرمائی وہ صدیوں بھلانے کے قابل نہیں۔ ہماری دلی دعا ہے کہ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں مقام اعلیٰ مرحمت فرمائے اور پسماندگانِ مرحوم کو صبر دے۔ آہ۔ ع "اب کہاں لوگ اس طبیعت کے"

معارف:- "اُردو کے ایک اور کہنہ صاحبِ قلم اُستاد کی وفات پر دو آنسو بہانا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اُسکی انشا پردازی اور نکتہ نوازی پر ملک کے اچھے اچھے اہلِ قلم رشک کرتے تھے، مگر افسوس کہ نوجوانوں نے اُس کو بھلا دیا، یہ خان بہادر میر ناصر علی مدیر "صلائے عام" دہلی تھے، مرحوم نے عمر کی چھیاسی بہاریں دیکھکر ۱۲ جون کو دہلی میں وفات پائی، ان کے قلم میں جو نزاکت اور اُن کے انشاء میں جو لطافت تھی وہ اب بھی ہماری زبان کا سرمایہ ہے، مگر افسوس ہے کہ آخر میں وہ یہ ساری جگر کاوی ان ناقدر شناس انگریز افسروں کے لئے کرتے تھے، جو ہندوستانی کو امتحان کے لئے سیکھتے تھے اور اسی لئے اُن کی ادبی کوششیں عام نگاہوں سے چھپکر رہ گئی تھیں۔ خدا اپنے دربار میں ہمارے اس بوڑھے صاحبِ قلم کی آبرو رکھے۔"

روزنامچہ خواجہ حسن نظامی

دہلی کے بڑے آدمی کی وفات:- افسوسناک خبر آئی کہ خان بہادر میر ناصر علی صاحب ایڈیٹر "صلائے عام" کا انتقال ہوگیا۔ وہ دہلی کے اُردو نویسوں میں سب سے پُرانے، سب سے زیادہ لائق، سب سے زیادہ نازک مزاج اور سب سے زیادہ خود پسند آدمی تھے۔ اور دہلی شہر کو اُن کی ذات پر فخر تھا۔ سُنا ہے نوّے برس کے قریب عمر تھی، لمبا قد۔ چھریرہ بدن۔ گندمی رنگ ڈاڑھی خشخاشی، تیزی سے بولنے والے اور بہت اچھا لکھنے والے، معلوماتِ عامہ میں بے مثل۔ تمام ہندوستان کے انشاء پردازوں کو خاطر میں نہ لانے والے تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اور ان کے پسماندوں کو صبر دے اور ان کی یادگار رسالہ "صلائے عام" جاری رہے جس کی مجھے بہت کم اُمید ہے۔"

مبادی علم المعیشت:- اکنامکس کے مسائل کی آغا محمد اشرف صاحب بی۔ اے نے نہایت سادہ اور آسان انداز بیان میں تشریح کی ہے جس سے یہ خشک مضمون نہایت دلچسپ بن گیا ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ ضخامت دو سو صفحات۔ قیمت صرف بارہ آنے (۱۲/) ساقی بکڈپو دہلی۔

دوسرا حملہ زیادہ زبردست ہوا تھا۔ دن کے دس یا گیارہ بجے ہونگے کہ ملازم آیا کہا میر صاحب کی آج طبیعت بہت خراب ہے تم کو بلاتے ہیں۔ میں گیا مرحوم کمرے میں اکیلے لیٹے تھے، گھبراہٹ ہو رہی تھی، فرمایا تم آگئے اور رونے لگے پھر کہا "دیکھو تم کو اس واسطے بلایا ہے کہ تم کو گواہ کرلوں۔ میں تمہارے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ خدا ایک ہے، بڑا شریف اور نیک ہے۔ اس کا رسول برحق ہے۔ تو گواہ رہیگا؟ میں نے عرض کی "ہاں میں گواہ ہوں"۔ بس ایک دم چارپائی سے اٹھ بیٹھے اور رو کر کہنے لگے کہ دیکھو میں نے بہت علم حاصل کیا خدا کی بہت تحقیق کی، لیکن میرے کچھ کام نہ آیا "دنیا سے اسی طرح جارہا ہوں جیسے آیا تھا" مجھے فوراً آپکے والد ماجد کا قول یاد آگیا جو مرحوم کی زبانی سُنا تھا ؎

اس چمن سے گل نہ تا بہ پیرہن لے جائینگے کیا یہاں سے آگے مرغانِ چمن لے جائینگے

کچھ توقف کے بعد فرمایا "دیکھو میری بصارت بھی کام نہیں دے رہی مجھے تمہارے خط وخال نہیں نظر آرہے" میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "تم ابھی نہ جانا جب تک میرا دم نہ نکل جائے دیکھ کر جانا کہ اسّی برس کے بعد کس طرح انسان کا دم نکلتا ہے"۔

اتنے میں انصار صاحب ڈاکٹر کو لے کر آگئے اور کہا "آپ نہ گھبرائیں ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں آپ ابھی اچھے ہو جائینگے"۔ فرمایا "اچھا ڈاکٹر صاحب کیا آپ آگئے"۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ گھبرائیں نہیں ابھی آرام ہو جاتا ہے"۔ فرمایا "دیکھئے اس وقت مجھے تکلیف نہ دیجئے اگر آپ نے اس وقت سلائی لگائی تو یہ ہوگا کہ ادھر آپ سلائی لگائینگے اُدھر میرا دم نکل جائیگا۔ میرے جلانے سے تم لوگوں کو کیا فائدہ ہو رہا ہے"۔ ڈاکٹر نے کہا تکلیف تو میں آپ کی ابھی کھوئے دیتا ہوں، اس کو تو رہنے نہیں دینے کا۔ اور موت زندگی خدا کے ہاتھ ہے ڈاکٹر نے سلائی لگائی بڑی تکلیف ہوئی چلّائے لیکن پیشاب سب خارج ہوگیا۔ ذرا آرام معلوم ہوا حلق خشک ہوگیا، نارنگی چھیل چھیل کر میں مرحوم کے مُنہ میں دیتا رہا پھر مثانہ کو دھویا گیا اس سے بھی سخت تکلیف ہوتی رہی یہ سب عمل ختم ہونے کے بعد بالکل چین پڑ گیا اور آنکھیں کُھل گئیں دس منٹ کے بعد آپ نے میری طرف دیکھا کہا "تم بیٹھے ہو۔ مُسکراتے ہوئے بھئی ان سب نے جلا لیا۔ اچھا اب تم جاؤ تمہیں دیر ہوتی ہے، ہرج ہو گا" ہاتھ ملایا میں آداب عرض کہہ کر چلا آیا پھر ایسا رہا کہ روزانہ سلائی کے ذریعہ پیشاب نکالا جاتا اور ایک مرتبہ مثانہ کو روز دوائی کے ساتھ دھویا جاتا۔

اب یہ تیسرا موقعہ تھا کہ ۵ رجون کو شام کے قریب ۶ بجے ملازم بلانے آیا۔ میں گیا، آداب عرض کی بیٹھ گیا۔ فرمایا "دیکھو آج ہم سب لڑکیوں وغیرہ سے رخصت ہو لیئے ہیں صرف ایک تم رہ گئے تھے سو تم سے بھی رخصت ہو لیں اس لئے تم کو بلایا ہے"۔ میں نے عرض کیا ایسا نہ کہیئے کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے۔ پیشاب رُک گیا ہوگا اُس کی تکلیف ہو گی ڈاکٹر کو بلائیے وہ پیشاب نکال جائیگا آرام ہو جائیگا فرمایا "نہیں یہ بات نہیں پیشاب تو کئی روز سے خود بخود آرہا ہے اور بڑے زور کے ساتھ آتا ہے، پائخانہ